آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جون 2020

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

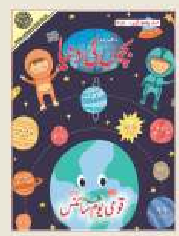

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	آمنہ ابوالحسن حیدرآباد کی ایک اہم فکشن نگار	محمد سرور لون	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		9
جہان نسواں	شہناز کنول کے افسانوں کا تنقیدی منظر نامہ	ڈاکٹر سیدہ نرجس فاطمہ	10
	محمد قلی قطب شاہ اوران کی بارہ پیاریاں	ڈاکٹر تسنیم بانو	16
	سیوان ضلع کی خواتین تخلیق کار	ڈاکٹر ارشاد احمد	20
	اردو کی غزلیہ شاعری میں طنزیاتی و مضحکاتی عنصر	ڈاکٹر روشن آرا	26
	ترنم ریاض کی افسانہ نگاری کا مختصر جائزہ	نگہت امین	33
	پروفیسر محمد انصار اللہ: بحیثیت محقق	ثنا عزل	37
کہانیاں	دل میں رب بستا	ڈاکٹر رینو بہل	42
	زندگی کا پیکیج	ڈاکٹر شبنم رضوی	46
	تحفہ	رخسانہ نازنین	49
	بیٹی	درخشاں پروین	51
حسن سخن	شہناز فاطمہ صدیقی		53
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		54
صحت	ایئر فریشر: محفوظ یا غیر محفوظ	عظیم اقبال	56
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		58
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		60
خواتین خبرنامہ			62

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد:4 شمارہ:6 جون 2020

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی- 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اوراس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ ادیب اپنے گردوپیش کے ماحول سے متاثر ہوکر ہی ادب تخلیق کرتا ہے۔ ادب میں اس وقت کی تہذیب، ثقافت اور طرز زندگی کے واضح نقوش دیکھے جاسکتے ہیں جس زمانہ میں وہ ادب تخلیق ہوا تھا۔ کسی بھی دور کی تہذیب کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ہم اس دور کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ادب کا تاریخ وتہذیب سے گہرا رشتہ ہوتا ہے ساتھ ہی ادب کا تعلق انسانی زندگی سے بھی ہے۔ انسان اپنی زندگی کو مختلف نظریات وخیالات کے تحت گزارتا ہے۔ تبدیلی انسانی زندگی میں بہت عمل دخل رکھتی ہے۔ اس تبدیلی کے سبب ادب میں بھی مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں اور اس تبدیلی کی وجہ سے انسانی اقدار بھی بدلتی رہتی ہیں۔

ادیبوں اور شاعروں کی کچھ سماجی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی استعداد کے مطابق معاشرے میں جو قلتیں یا تبدیلیاں آتی ہیں ان کا حل ڈھونڈ ھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر اس وقت کچھ نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس تبدیلی کا اثر ادب پر بھی دیکھا گیا۔ اس وقت کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے طور پر اس وقت رونما ہونے والے حادثات کا کھل کر بیان کیا۔ کچھ ادیب ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی شاعری سے ہندوستانیوں کے دلوں میں اپنے ملک کے تئیں محبت، جوش اور ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انگریزوں کے تسلط سے پیدا ہونے والے جبر کا بیان انھوں نے بے خوف ہوکر اپنی شاعری میں کیا۔ لہٰذا اس وقت کے ادیبوں نے اپنے ملک کے تئیں آزادی کے نغمے گائے اور ادب میں ایسی تخلیقات کو پیش کیا جو ان کے جذبۂ آزادی اور ان کی وطن پرستی کو نمایاں کرتی ہیں۔

مرد ادیبوں کی طرح خواتین تخلیق کاروں میں بھی حالات کے تحت تبدیلی واقع ہونا فطری ہے۔ خواتین ذہنی اعتبار سے مردوں سے کمتر نہیں ہیں۔ مرد ادیبوں کی طرح وہ بھی اپنی مثبت سوچ اور فکر کے ذریعے معاشرے میں انقلاب لاسکتی ہیں۔ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جائے کیونکہ تعلیم ہی ان کی تقدیر اور تصویر بدل سکتی ہے۔ عورتوں کی تعلیم آج کے سماج کا بہت اہم مسئلہ ہے، ماضی میں بہت سے دانشوران نے اس سمت میں کوششیں کی ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی اور دیگر علما اور ادبا نے خواتین کی تعلیم پر بہت زور دیا اور حقوق نسواں کی حمایت کی۔ اب خواتین تخلیق کاروں کو چاہیے کہ وہ ایسا ادب تخلیق کریں جس سے معاشرے کے مسائل کی عکاسی ہوسکے۔ خاص طور پر عورتوں کی تعلیم پر زیادہ زور دیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ادب میں موضوعات کا دائرہ وسیع ہو۔ ادب کو سماج کا آئینہ کہا جاتا ہے لہٰذا ایسے موضوعات کو ادب میں جگہ دی جانی چاہیے جو بامقصد ہوں اور ملک وقوم کے حق میں مفید ثابت ہوں اور سماجی بیداری میں اہم رول ادا کرسکیں۔ ادب ہمارے جذبات واحساسات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ملک میں بیداری لانے کا بھی اہم فریضہ انجام دیتا ہے لہٰذا ہمارے ادیبوں ودانشوروں کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو عوام کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کرسکے۔ خاص طور پر طبقہ نسواں کو بیدار کرنا آج کی ایک اہم ضرورت ہے۔

'خواتین دنیا' کی تعریف ہمیں تاثرات کی شکل میں ملتی رہتی ہے۔ قارئین رسالے میں موجود مضامین، افسانوں اور غزلوں کو سراہتے ہیں۔ اس رسالے کی کامیابی میں قارئین کا اہم رول ہے۔ 'خواتین دنیا' کی اشاعت کا مقصد ہی خواتین کی ذہنی، سماجی، معاشی اور اقتصادی سطح پر ان کی ذہن سازی کرنا ہے تاکہ وہ بھی اپنی فکر اور سوچ کا اظہار کرسکیں اور معاشرے میں آئی تبدیلی کا خیر مقدم کرسکیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

محمد سرور لون

آمنہ ابوالحسن

حیدرآباد کی ایک اہم فکشن نگار

آمنہ ابوالحسن کا نام حیدر آباد کی فکشن نگار خواتین میں اہمیت کا حامل ہے۔ سید آمنہ ابوالحسن جو آمنہ ابوالحسن کے نام سے ادبی دنیا میں جانی جاتی ہیں، کی پیدائش حیدر آباد میں 10 مئی 1941 کو ہوئی۔ ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ خاندان سے تھا۔ آپ کے نانا اپنے وقت کے جید عالم تصور کیے جاتے تھے۔ آمنہ ابوالحسن کے والد کا نام ابوالحسن سید علی تھا۔ آمنہ ابوالحسن کے بچپن میں ہی ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اپنے والد کے زیر سایہ انھوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کے والد ابوالحسن سید علی مرحوم نامور قانون داں اور سیاست داں تھے۔ مصنفہ کی شادی دورانِ تعلیم ہی جناب مصطفیٰ علی اکبر صاحب سے ہوئی جو آل انڈیا ریڈیو میں نیوز ریڈر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ آمنہ ابوالحسن کا انتقال 9 اپریل 2005 کو ہوا۔ ادب کے علاوہ موسیقی اور مصوری سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ اس لیے ان کی بیشتر کہانیوں کے موضوعات موسیقی سے تعلق رکھتے ہیں۔

آمنہ ابوالحسن ابتدا میں زیادہ تر افسانہ نگاری کی طرف مائل رہیں اور بعد میں ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ان کی پہلی کہانی ''ننھی کلی'' کے عنوان سے بچوں کے لیے شائع ہونے والے رسالے میں شائع ہوئی تھی، اس وقت موصوفہ آٹھویں جماعت کی طالبہ تھیں۔ کہانی شائع ہونے کے بعد ان کے قلم میں خود اعتمادی آگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تخلیقات یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آنے لگیں۔ آمنہ ابوالحسن کی تخلیقات میں دو افسانوی مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کہانی'' 1965 اور دوسرا افسانوی مجموعہ ''بائی فوکل'' 1990 میں شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''کہانی'' میں 10 اور دوسرے مجموعے ''بائی فوکل'' میں 16 افسانے شامل ہیں۔ آمنہ ابوالحسن کے ان دو افسانوی مجموعوں کے علاوہ بے شمار افسانے ہندوستان و پاکستان کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے جیسے بیسویں صدی، شاعر، سب رس، صبا، لندن سے نکلنے والے مشرق، اور حیات نو وغیرہ۔

آمنہ ابوالحسن اپنے دور میں ایک فکشن نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عصری تقاضوں اور تجربات کے

ذریعے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں عصری حسیت ہی نہیں بلکہ رومانی احساس اور فکر کی گہرائی بھی دکھائی دیتی ہے۔ اپنے افسانوں میں ماحول، معاشرت اور جنس کے علاوہ زندگی کے مسائل کو شامل کر کے انھوں نے ادب کے سماجی تصور کو پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اُن کی افسانوی نثر میں زبان کا رچاؤ اور اظہار کا سُبک پن دکھائی دیتا ہے۔ آمنہ ابوالحسن نے اُس وقت افسانہ نگاری کی طرف توجہ دی جب ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا زور تھا۔ لیکن اُن کی افسانہ نگاری میں ترقی پسند تحریک کے اثرات اور اُس سے متاثر ہونے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ جس دور میں انھوں نے افسانہ نگاری کی روایت کو فروغ دیا اس کا جائزہ لیتے ہوئے نکہت سلطانہ لکھتی ہیں:

''آمنہ ابوالحسن نے جس زمانے میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا اُس وقت مرد افسانہ نگاروں کے علاوہ خاتون افسانہ نگاروں کی خاصی تعداد موجود تھی اور ہر افسانہ نگار اپنے اپنے طور پر فن کی آبیاری کر رہا تھا۔ کوئی خاندانی رشتوں کی ڈور سنبھالے ہوئے تھا تو کوئی گاؤں، کھیت کھلیان پر اپنی نگاہ مرکوز کیے ہوئے تھا کوئی انسانی جذبوں کا پاس ولحاظ رکھ رہا تھا تو کوئی نفسیات کو اپنے افسانوں میں جگہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی طرح کوئی افسانہ نگار فساد اور تقسیم کے موضوع کو افسانے میں شامل کر رہا تھا تو کسی افسانہ نگار نے جنسی رجحانات اور اس سے پیدا ہونے والی برائیوں کی طرف اشارہ کیا۔ بہرکیف ہر تخلیق کار نے اپنے زورِ قلم سے سماج اور اس کے اردگرد کے ماحول کو پیش کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔''

(از نکہت سلطانہ، آمنہ ابوالحسن سوانح اور ادبی خدمات (مقالہ برائے ایم فل) یونی ورسٹی آف حیدر آباد 1999، صفحہ 76)

آمنہ ابوالحسن نے خود اپنے افسانوی مجموعے ''کہانی'' کے ذریعے جن حقائق کی نشاندہی کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا تخلیقی سفر کسی کی فرمائش یا دِل بہلاوے کے لیے نہیں بلکہ ان کی تخلیقات ایک خاص مقصد رکھتی ہیں۔ چنانچہ وہ خود لکھتی ہیں:

''لکھنے کی خاطر کبھی نہیں لکھ سکی۔ فرمائش پر بھی نہیں۔ بلکہ اردگرد بکھری ہوئی زندگی میں پیش آنے والے واقعات ہی ہمیشہ اسکے محرک بنے۔ علم سے زیادہ مشاہدہ نے میرا ساتھ دیا۔ جس طرح علم انسانی اذہان کے مختلف گوشے اپنے آب و تاب سے منور کرتا ہے اسی طرح مشاہدہ ہر اس بڑی اور مشکل ترین کیفیت سے بذاتِ خود گزار دیتا ہے جو بسا اوقات الفاظ سے اخذ کرنا مشکل ہے۔''

(آمنہ ابوالحسن، کہانی، صفحہ 10)

آمنہ ابوالحسن نے اپنی زندگی میں جو کچھ بھی تجربات و مشاہدات حاصل کیے انھیں اپنے قلم کے ذریعے کرداروں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ کردار نگاری ان کے افسانوں کی ایک خصوصیت رہی ہے۔ افسانہ نگار جو کچھ بھی محسوس کرتا ہے وہ اپنے خیالات کو کرداروں کے ذریعے قارئین تک پہنچاتا ہے۔ اُن کی کردار نگاری کے بارے میں ایک اور خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے قارئین کو متاثر کرنے کے لیے اپنے افسانوں میں کہیں کہیں فلمی گیت، بھجن اور نغمے بھی شامل کیے ہیں۔ جس سے افسانوی ماحول میں نغمگی کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ اُن کے افسانے میرا ناچی رے، اندھیرا دل اور روشنی اور پیلا پھول میں فلمی گیتوں، بھجنوں اور نغموں کو جگہ دی گئی ہے۔

افسانہ ''میری میا'' کی کہانی ایک ٹھیلہ بندی راہ ونایک کے ارد گرد گھومتی ہے۔ ونایک دن بھر کی کمائی لال مرچ اور کیریوں کی فروخت سے ہونے والے پیسے سے دوستوں کو سنیما دکھاتا اور شراب پی کر اڑا دیتا ہے اس کی ماں ریشمی کو شکایت رہتی ہے کہ گھر میں پیسے نہیں دیتا تو شادی کس طرح کروں گی ایک دفعہ ونایک ماں کو پچاس روپے دیتا ہے۔ ماں

ایک لڑکی دیکھ کر شگفتلا سے اس کی شادی کر دیتی ہے۔ شادی کے جشن کے دن ہی داروغہ ایک کانسٹبل کے ساتھ آ کر ونایک کو گرفتار کر لیتا ہے۔ سارے مہمان پریشان ہو جاتے ہیں تب ونایک فخر سے کہتا ہے کہ اس نے شگفتلا پر الزام لگایا تھا اس لیے میں نے اسے قتل کر دیا۔ یہ افسانہ غریب طبقے کی دکھ بھری کہانی ہے۔

افسانہ ''میرا ناچی رے'' عشق و محبت میں تڑپنے والوں کی داستان ہے۔ نشاط زماں سے محبت کرتی ہے اور ایاز نشاط سے محبت کرتا ہے جب کہ زماں شادی شدہ ہے اور اس کے بچے بھی ہیں۔ نشاط کو اس لیے زماں پسند ہے کہ وہ نشاط کے ناچ گانے کو پسند کرتا ہے۔ نشاط کا خیال ہے کہ انسان، گوشت اور جسم ہی نہیں دل و دماغ بھی ہے چنانچہ وہ زماں کے قریب ہو جاتی ہے۔

آمنہ ابوالحسن نے شہری زندگی سے ہٹ کر دیہاتی لوگوں کی زندگی کی بہت عمدہ نمائندگی کی ہے۔ وہاں کے کھیت کھلیان، دیہات کا پس منظر وہاں کی بولیوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ان افسانوں میں ''آوا'' اور ''برجو'' ''لیبل'' اور ''میری میا'' میں بہتر انداز میں تجزیہ کیا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کے دوسرے افسانے ''پتھر کی قیمت''، ''منزلیں دار کی''، ''دریچہ'' میں مکالمے حسب واقعات تحریر کیے گئے ہیں۔ منظر کشی عمدہ کی گئی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ عصمت و عفت کا خیال رکھا ہے۔ کسی جگہ بھی مخرب الاخلاق مکالمے تحریر نہیں کیے۔ افسانے کی ابتدا سے اختتام تک قاری اور تخلیق کار کا رشتہ برابر قائم رکھا ہے۔

آمنہ ابوالحسن نے افسانوں کے علاوہ متعدد ناول لکھے جنھیں اردو ادب میں بہترین ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ''سیاہ سرخ سفید''، ''تم کون ہو''، ''واپسی''، ''مہک''، ''یادش بخیر'' وغیرہ۔

آمنہ ابوالحسن کا سب سے پہلا ناول ''سیاہ سرخ سفید'' 1968 میں نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ یہ ناول 224 صفحات پر مشتمل ایک رومانی ناول ہے۔ ناول کی ابتدا میں ''دو چار باتیں'' کے تحت انھوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اب تک وہ زندگی کے حسن اور رنگوں، خوشبو اور دلکشی کو دیکھتی رہی ہیں اور اب تلخ حقائق کی پیش کش کی سمت قدم بڑھا رہی ہیں۔

ناول ''سیاہ سرخ سفید'' میں ہیروئن نشاط اور اس کے شوہر کی ازدواجی زندگی کی جنسی کشمکش کو مصنفہ نے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں بنیادی طور پر تین کردار ہیں، نشاط، جس کی کہانی لکھنے کا مصنفہ نے دعویٰ کیا ہے۔ نشاط کا عاشق اور اس کے شوہر فرخ کا دوست الطاف جو مصور ہے اور نشاط کو مصوری کی تعلیم دیتا ہے۔ نشاط ایک جگہ اپنے شوہر کے بارے میں کہتی ہے:

''فرخ کا پیار وہ آبشار ہے جو اپنی تیزی اور روانی میں فقط اپنے ہی راستے بہتا ہے۔ جو خود میں آملنے والے جھرنوں کی جھنکار نہیں سنتا۔ نہیں پہچانتا، مگر جھرنوں کی بھی ایک حقیقت ہوتی ہے۔'' (سیاہ سرخ سفید، ص:75)

دراصل یہی ٹریجڈی اس ناول کا مرکزی تھیم ہے اور دوسرے واقعات کی محرک بھی۔ ناول نگار نے نشاط کا کردار پیش کر کے اور طرز عمل کو جائز قرار دے کر یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ عورت صرف دولت، عیش و آرام، محلوں کی رہائش اور سامان آرائش سے خوش نہیں ہو سکتی۔ بلکہ بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں دل کا گھر چاہیے۔ توجہ کی روشنی اور اپنائیت کا احساس چاہیے۔ نشاط بھی ایک ایسی لڑکی ہے جو اپنے خول میں بند رہنا چاہتی ہے۔ اس ناول کی کہانی روایتی انداز کی ہے لیکن اس کے باوجود اس ناول میں نفسیاتی انداز بینی کے علاوہ دیگر پہلو کمرشیل نقطہ نظر سے پیش کیے گئے ہیں۔ نشاط کی کردار نگاری نے اس ناول کو کامیابی سے ہم کنار کیا ہے۔ آمنہ ابوالحسن کے ناولوں کے کردار اور موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے نگینہ جبین لکھتی ہیں:

''جنسیات ان کا پسندیدہ موضوع ہے ۔ جسے وہ اپنے کرداروں کے جذباتی اور نفسیاتی ہیجان کی شکل میں پیش کرتی

ہیں۔ جنسی خواہشات کی تکمیل میں ان کے نسوانی کردار ہی زیادہ سرگرداں نظر آتے ہیں۔ آمنہ ابوالحسن کے نسوانی کرداروں کی کسی طرح کی سماجی حیثیت نہیں بنتی۔ ان کے دو ایک مردوں سے سماجی تعلقات ہیں۔ جو دھیرے دھیرے نسوانی کرداروں کے ساتھ نفسیاتی اور جذباتی طور پر وابستہ ہو جاتے ہیں، جسے کھینچ تان کر سماجی کہا جاتا ہے۔''

(نگینہ جبین، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، ص 303)

ان کا دوسرا ناول ''تم کون ہو'' خود ان کے بیان کے مطابق 1969 میں لکھا گیا تھا مگر پہلی بار 1974 میں نیشنل پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدر آباد سے شائع ہوا۔ یہ ناول 164 صفحات پر مشتمل ایک معاشرتی ناول ہے۔ آمنہ نے اس ناول میں شوہر اور بیوی کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہیے، جیسے اہم موضوع کو اجاگر کیا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کا ایک اور ناول ''واپسی'' 1981 میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گول مارکیٹ سے شائع ہوا۔ یہ ناول بھی رومانی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول میں تین بنیادی کرداروں یاسمین، ایمن اور شہریار کی داستان محبت بیان کی گئی ہے۔ آمنہ ابوالحسن کے ناول ''سیاہ سرخ سفید'' اور ''ہلس مائی نس'' کو سامنے رکھیں تو واقعات اور کرداروں کی سطح پر یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔

آمنہ ابوالحسن کا ناول ''آواز'' دسمبر 1985ء میں ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ پیش لفظ کے طور پر صرف پانچ سطریں لکھی ہیں۔ یہ ناول قومی یک جہتی کے نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے مگر واقعات و کردار فلمی انداز کے ہیں اور حد سے زیادہ ڈرامائی کیفیت فنی طور پر ناول کو کمزور کر دیتی ہے۔

آمنہ ابوالحسن کا ناول ''ہلس مائی نس'' موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی کے زیر اہتمام پہلی بار 1987 میں شائع ہوا۔ یہ ناول دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول کا بنیادی مزاج رومانی ہے۔ ناول کا محور صرف ایک نسوانی کردار یاسمین ہے جس کے چاروں طرف کہانی گردش کرتی ہے۔ مصنفہ نے اس کردار کے توسط سے نوجوان لڑکے، لڑکیوں کے جنسی مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ جس سے عام سماجی زندگی میں رائج کچھ رسم و رواج پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ ناول موضوع کے اعتبار سے کافی اہم ہے جسے ابتدا میں ناول نگار نے فنکارانہ طور پر پیش بھی کیا ہے، لیکن نشاط کی موت کے بعد مصنفہ ناول میں گرفت نہیں رکھ سکیں اور اس کی پیش کش نے ناول کو اختتام تک لاتے لاتے ایک کمزور ناول بنا دیا ہے۔

''یادش بخیر'' 1994 میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ ناول ''یادش بخیر'' میں قدیم تہذیب اور جدید دونوں رجحانات پائے جاتے ہیں۔ مصنفہ نے ناول میں کہیں کہیں خود کلامی سے کام لیا ہے اور اس کے وسیلے سے کرداروں کے افکار و تصورات کی ترجمانی کی ہے۔

بہر کیف آمنہ ابوالحسن نے اپنے فکشن میں اپنی احساس فکری سے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو حقیقت نفس الامری بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کے فکشن میں سماجی، سیاسی، ثقافتی اور معاشرتی پہلوؤں کو بہتر طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے فکشن میں جس طرح محسوسات کو حقیقت کا جامہ پہنا کر معاشرے کے سامنے پیش کیا گیا ہے، وہ بہت کم تحریروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ آمنہ ابوالحسن نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کی بہتات ہے۔ ان کے فکشن میں کوئی نہ کوئی نیا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔

□□□

Mohd Sarwar Lone
Phd Research Scholar
Deptt. Of Urdu University Of Hyderabad
Gachibowli
Hyderabad-500046 (Telangana)

شاعرات کے منتخب اشعار

اپنوں کی طرح آئے چپ چاپ گئے اپنے
صندل کے کٹوروں کی اک رسم نبھانا تھی

حنائی دست کو لہرا کے خوش فضاؤں میں
خوشی سے لوٹ کے آنے کا اک شگون کرنا

صغریٰ عالم

حس تغزل میں حسنی سوز جگر یوں سایہ فگن ہو
جیسے شمع کہیں جلتی ہو جھلمل سی مدھم مدھم

خوشبو سی کوئی سوئے قفس آنے لگی ہے
شاید کہ کسی نے مجھے پھر یاد کیا ہے

حسنی سرور

دیوار و در میں سمٹا اک لمس کا نپتا ہے
بھولے سے کوئی دستک دے کر چلا گیا ہے

شل ہوئے ہاتھ ہمارے تو کوئی بات نہیں
برف کی سل کا یہ حصہ ذرا ٹوٹا تو سہی

بلقیس ظفیر الحسن

وہ آ کے تیرے شہر سے جا بھی چکا مگر
چشم امیدوار ترے ساتھ کون تھا

آنکھ بھر آئی کہ یادوں کی دھنک سی بکھری
ابر برسا ہے کہ کنگن کی کھنک سی بکھری

عرفانہ عزیز

اے گھٹا روک لے بارش اپنی
آنکھ ان کی بھی تو بھر آئی ہے

آج خوشبو ہے فضا میں کیسی
ان کے کوچے سے صبا آئی ہے

مریم غزالہ

دل میں جو ہے وہی زباں پر
آئینہ کی طرح کھری ہوں

خیر انا کے صنم کدوں کی
ضد پہ میں بھی اڑی ہوئی ہوں

ناہید اختر

نجم پرائے نہیں اپنے ہیں وصیہ سچ ہے
ہم نے جو بات لکھی دل کی زبان لکھی

یوں ٹوٹ کے بکھروں گی نہ معلوم تھا دل کو
یہ وہم کہ وہ مجھ کو منانے کے لیے تھا

فاطمہ وصیہ جائسی

اک عمر بیتی مگر آج تک گئے ہی نہیں
ترے غضب کے مرے ضبط کے کمال کے دن

صبح تک دیکھی تھی سورج کے لبوں پر اک ہنسی
شام تک شبنم کی پلکوں پر نمی ٹھہری رہی

رفیعہ شبنم عابدی

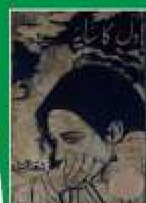

ڈاکٹر سیدہ نرجس فاطمہ

شہناز کنول

کے افسانوں کا تنقیدی منظر نامہ

افسانہ نثر کی ایک اہم صنف ہے۔ کہانی کہنے کا فن بڑی حد تک شعوری ہے۔ گپھاؤں اور غاروں میں رہنے والا انسان بھی اپنے اندرون کا اظہار کہانی کے ذریعہ کرتا تھا۔ شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ کہانی کا ارتقاء بھی نظر آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے بعد دنیا کے تقریباً ہر خطّے میں بڑی بڑی کہانیاں نظر آتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ کہانی کا تعلق ہمیشہ کسی نہ کسی آرٹ فورم (Art form) سے رہا ہے۔ ابتداً کہانی تصویروں کے ذریعہ بیان کی جاتی تھی۔ زبان کے وجود کے بعد یہ الفاظ میں بیان ہونے لگیں۔ اس صنف ادب کی شروعات بھی ہمیں یونان سے ملتی ہے، جہاں چھوٹی چھوٹی سبق آموز کہانیاں لکھی گئیں۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ کہانی ہمیشہ تہذیب وثقافت سے متعلق رہی ہے، وہ اپنے دور کی تصویر کشی کرتی ہے۔ تہذیب ومعاشرت زندگی کے تئیں مختلف رویے، اپنے دور کا سماجی منظر نامہ سب کچھ کہانی میں موجود ہوتا ہے۔ ان سے اوّلین ادوار کی تاریخ متعین کی جاسکتی ہے، جن میں سیاسی، سماجی اور معاشی منظر نامہ موجود ہوتا ہے۔ جاننا چاہیے کہ کہانی نظم ونثر دونوں میں کہی جاسکتی ہے۔ نیز ناٹک بھی اس سے خالی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ بیان کیا گیا کہ کہانی مختلف (Art forms) کے ذریعہ بیان کی جاتی ہے، مصوری، شاعری، سنگ تراشی، ناٹک اور دیگر فنونِ لطیفہ کے لیے کہانی مواد بنتی ہے، گویا کہانی محض ہیئت (form) نہیں، مواد (Content) بھی ہے۔ ارتقائی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ کہانی ہر زبان میں موجود ہے اور ادب کی روح ہے۔ نیز یہ کہ کہانی تہذیب وثقافت کی ارتقائی داستان ہے، اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ مذہبی کہانیاں، حکایت، داستان، قصہ اور پھر مختصر کہانی اور افسانہ۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں کیونکہ ہمیں صرف افسانے سے ہی سروکار ہے۔ بیان کیا گیا کہ کہانی ہر زبان میں موجود ہے۔ ہم یہاں اُردو میں مختصر کہانی یا افسانے پر گفتگو کریں گے۔

شعر کے ساتھ ساتھ اصناف نثر میں بھی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ انگریزی ادب کے مطالعے کے تحت داستان گوئی کا زوال اور اردو میں ناول اور مختصر کہانی کی ابتدا نظر آتی ہے، گویا یہ دونوں نثری ہیئتیں (Genre) انگریزی ادب سے ماخوذ ہیں۔ اس خیال سے بڑی حد تک اتفاق کیا جاسکتا ہے لیکن یہ کلیہ نہیں، کیونکہ اردو کے دامن میں فارسی حکایتوں جو عربی یا قصص القرآن سے ماخوذ ہیں، اور سنسکرت کتھاؤں نیز جاتک کتھاؤں، جن میں بدھ ادب زیادہ ہے، کا خزینہ موجود تھا، جو طویل داستانوں سے بالکل مختلف تھا۔ یہ کہانیاں نوعیت کے اعتبار سے سبق آموز ہیں، ان کا رنگ مذہبی اور اخلاقی ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان کا مقصد درستگئ اخلاق تھا۔ انگریزی ادب میں ناول اور مختصر کہانی میں اس عنصر کو نظر انداز کیا گیا۔ آسکر وائلڈ اور اس کے دوسرے ہمعصر ادب میں کسی بھی مقصد کے قائل نہیں تھے۔ ادب از خود مقصود بالذات ہے اور یہ امر اس کی ہر صنف پر صادق آتا ہے، لہٰذا اس ادب کے تحت اردو کہانی کی شروعات میں یہ عنصر نظر نہیں آتا، ہمیں یہاں ناول کی ابتدا سے بحث نہیں۔ اردو میں مختصر کہانی 1901 سے نظر آتی ہے۔ ابتدا میں تخلیق کے بجائے تالیف کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ عام طور پر کہانی لکھنے والوں نے اس دور میں انگریزی فرانسیسی اور روسی مختصر کہانیوں کے تراجم کیے۔ باقاعدہ طور پر کہا جاسکتا ہے کہ راشد الخیری اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے ڈپٹی

نذیر احمد کی طرح مسلمانوں کے مسائل پر افسانے لکھے لیکن ابتدائی دور کا سب سے بڑا نام پریم چند ہے۔ ان کے افسانوں کا منظر نامہ معاشرتی ہے، بڑی تبدیلی یہ تھی کہ اب افسانہ ترجموں کے دور سے نکل کر سیاسی و سماجی مسائل پر مرکوز ہوگیا۔ پریم چند نے 1936 کی ترقی پسند تحریک کی کانفرنس میں کہا تھا کہ ہمیں حُسن کا معیار بدلنا ہوگا۔ اردو ناول یا افسانے کا ارتکاز اس سے قبل بھی معاشرت تھا۔ فردوس بریں ہو یا امراؤ جان ترجمہ کی ہوئی مختصر کہانی یا راشد الخیری کے افسانے ان سب کا مرکز سماج ہے، بالخصوص امیر طبقہ یا طوائف کے کوٹھے، کیونکہ وہ اس تہذیب کے خاص عناصر تھے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ افسانے بڑی حد تک رومانی اور اصلاحی ہیں۔ پریم چند نے ایک نیا موضوع اور عنوان دیا اور افسانے کا علاقہ غریب طبقہ سے وابستہ کردیا۔ اسی زمانہ میں 1930 کے بعد انگارے کی اشاعت ہوئی، جس میں رشید جہاں، کرشن چندر اور دیگر لوگوں کے افسانے تھے۔ افسانوں کے اس مجموعے نے سیاسی انقلاب پیدا کردیا اور اسے بین کردیا گیا۔ ترقی پسند تحریک نے ان موضوعات کو جلادی اور ادب کی ہر صنف میں انقلاب کے بلند آہنگ نغمے پیش کیے۔ اس دور کے افسانہ نگار اس کا بیّن ثبوت ہیں۔

1947 اور اُس کے بعد کہانی کی دنیا میں ایک اور موڑ آیا۔ اس دور کے تمام بڑے بڑے افسانہ نگار منٹو، کرشن چندر اور بیدی وغیرہ نے بٹوارے سے پیدا ہوئی تباہ حالی کو اپنا موضوع بنایا۔ منٹو کا خاص موضوع عورت کے ساتھ ہونے والی زیادتی تھی۔ باقی مصنفین نے اس بٹوارے میں انسانیت کے بری طرح مجروح ہونے پر زورِ قلم صرف کیا اور پورے منظرنامے کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا۔ خاص بات یہ کہ اس وقت ادب کے مارکسی نظریے کے تحت حسن کے تصور کو پیش کیا گیا۔ حامد کا خریدا ہوا معمولی چمٹا مٹی کے خوبصورت کھلونوں کے مقابلے حسین خیال کیا گیا گویا افادیت حسن کا معیار ٹھہری۔ نیز محنت اور فطرت اس کے عناصر سمجھے گئے۔ اس زمانے میں بھی رومانی اور اصلاحی افسانے لکھے جارہے تھے لیکن اُن میں بھی حال کی خلش، ماضی کی بازگشت اور بہتر مستقبل کی آس موجود تھی۔ اُن افسانوں میں بھی حسن کا یہ بدلتا ہوا تصور کسی نہ کسی حیثیت سے موجود ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں میں بالخصوص ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور ہاجرہ نازلی وغیرہ ہیں، جن کے یہاں سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل موجود ہیں۔ نیز عورت کا بدلتا ہوا تصور بھی موجود ہے۔ قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، جیلانی بانو اور واجدہ تبسم وغیرہ کے یہاں موضوعاتی تنوع اور نظریاتی تصادم ملتا ہے۔ فی الوقت ہمیں ہمعصر افسانہ نگاروں بالخصوص شہناز کنول غازی سے سروکار ہے۔ افسانے کا یہ سفر ان کی ذہنی تشکیل میں معاون ہے۔

ہر ادیب اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے، اس کا اثر قبول کرتا ہے اور اپنے شعوری ارتقاء کے مطابق اس سے انحراف بھی کرتا ہے اور کبھی اصلاح بھی کرتا ہے۔ شہناز کنول نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ اردو ادب میں ایک تبدیلی کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ پہلی تبدیلی بالخصوص افسانے کی دنیا میں ادبِ لطیف اور رومانیت سے نکل کر ترقی پسند تحریک کی صورت میں نظر آتی ہے، جس کے مضمرات ''انگارے'' کی اشاعت سے دکھائی دینے لگے تھے، یہ وہ دور ہے کہ ہندوستان کی ہر زبان کے ادب بشمول اردو میں روسی انقلاب جو مارکسیت کے تحت معرضِ وجود میں آیا تھا سے متاثر نظر آتا ہے، بعد ازاں ملک کے بٹوارے کے سبب ایک اور شفٹ دکھائی دیتی ہے اس کے سبب مختلف موضوعات جن کا عوام الناس سے تعلق تھا، افسانے میں بیان کیے جانے لگے تھے۔ کسی بھی دور میں کوئی بھی مخصوص ادبی رجحان کلی طور پر حاوی نہیں ہوتا دیگر رجحانات بھی ہوتے ہیں۔ ترقی پسند دور میں بھی اربابِ اہلِ ذوق کی تنظیم موجود تھی، جو ادبِ لطیف اور رومانیت کی حمایت کرتی تھی۔ شہناز کنول کے افسانے پڑھنے پر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس تحریک سے زیادہ متاثر ہیں۔ ان کے افسانوں میں جو جمالیاتی اقدار نظر آتی ہیں اُن کا تعلق انہی عناصر سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔

شہناز کنول نے ایک مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد علم دوست اور نیک خصلت تھے، ان کی والدہ ہاجرہ نازلی اپنے زمانے کی مشہور فکشن نگار تھیں، یہی سبب ہے کہ شہناز کنول کے افسانوں میں نیکی کا عنصر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ ان کے بھائی عابد اللہ غازی نے صحیح فرمایا کہ وہ دوقلم لے کر پیدا ہوئیں ان کا یہ بیان داخلی ہوسکتا ہے لیکن محض جذباتیت پر مبنی نہیں۔ شہناز کنول کے افسانے پڑھ کر اس کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔ علم دوستی کا جذبہ، تربیت کی اہمیت، تہذیبوں کا تصادم، شخصیات کا تشخص اور ان کا عمل اور ردِعمل سب اس کی دلیلیں ہیں۔ انھوں نے ادوار کا عروج و زوال دیکھا ہے، زمانے کے نشیب و فراز سے گزری ہیں۔ حالات کے تقاضوں کو سمجھا ہے، نیز اپنے اور دوسروں کے مسائل کو محسوس کیا ہے اور یہ سب کچھ ان کے افسانوں کا مواد ہے۔ شہناز کنول کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات و موضوعات کے سبب اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے الگ ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ایک فکری سطح ہے، جو انھیں شاید اُن کے علمی ورثے سے حاصل ہوئی ہے اور جس کے تحت سمجھا جاسکتا ہے کہ انھوں نے زندگی کو محض گذارا نہیں سمجھا بھی ہے، وہ اُسے وقت کے سانچے

میں دیکھتی ہیں، حال اور ماضی کی اقدار کا موازنہ کرتی ہیں اور بہتر مستقبل کی خواہاں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کے افسانوں پر تنقیدی نظر ڈالنی چاہیے اور انھیں دوبارہ دریافت کرنا چاہیے(Rediscover)

شہناز کنول جیسا کہ بیان کیا گیا مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں لہٰذا اُن کا مسائل کے تئیں نظریہ مذہبی ہے۔ انھیں اپنے ماحول اور معاشرے سے یہی نظریہ ورثے میں ملا ہے۔ ان کے افسانوں کا بغور مطالعہ کیجیے تو ہمیں اس کا اندازہ ہوگا۔ ''داستاں گو''، ''دعاؤں کا حصار'' اور ''غیبی آواز'' میں مسائل پر اسی نظریے کے تحت روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے افسانوں کا رنگ وزاویۂ نگاہ مذہبی ہے۔ داستان گو کا غم واندوہ کے مارے لوگوں کو اُن سے باہر آنے کی ہمت دلانا، تقدیر پر یقین رکھنے کی بار بار تلقین کرنا، لیکن تقدیر کو تدبیر سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر بار بار زور دینا، افسانے کو حقیقت سے قریب کردیتا ہے۔ دعاؤں کا حصار جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ عورت کی مذہبی تربیت کی ضرورت کو بیان کرتا ہے، جو ہمیں خاندان اور اس کی تہذیب سے ورثے میں ملتی ہے۔ شہناز کنول کے یہاں یہ تہذیبی ورثہ قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر افسانوں میں یہ عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ اس قدر کو زندگی کے لیے ضروری سمجھتی ہیں، مزید برآں ان کے اور بہت سے افسانوں میں دیگر مذہبی اقدار پر بھی زور دیا گیا ہے، مثلاً خدائے واحد پر مکمل یقین، قضاوقدر کا نظریہ، انسانیت کے جوہر کی شناخت اور اس کو تسلیم کرنا اور اسی قسم کی دیگر اقدار بھی موجود ہیں۔ مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ شہناز کنول کے یہاں کہیں بھی تنگ نظری نظر نہیں آتی۔ وہ انسانیت کے جوہر کو ہر مذہب کی روح سمجھتی ہیں، نیز یہ اُن کا خیال ہے کہ مذہب امن وآشتی کا درس دیتا ہے۔ آزادی، مساوات واخوت ہر مذہب کی اعلیٰ قدریں ہیں، ان کو تسلیم کیے بغیر کوئی بھی مذہب رواج نہیں پاسکتا یا کم سے کم مقبول نہیں ہوسکتا۔ ان کا افسانہ ''واپسی'' اس کی بہترین مثال ہے۔

شہناز کنول اپنے افسانوں کا مواد سماج سے حاصل کرتی ہیں۔ وہ معاشرے میں پیش آنے والے واقعات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل پر افسانہ تخلیق کرتی ہیں، انھوں نے خود احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے اپنے افسانوں کے مجموعے ''دل کی زمین'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ سڑک پار کرتے ہوئے ایک بچے نے ہاتھ پھیلا کر اُن سے بھیک مانگی اور انھوں نے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر کہانی لکھ دی۔ کسی اور مشہور ادیب کا خیال ہے کہ ہمارے اطراف میں کہانیاں بکھری پڑی ہیں، ہمیں انھیں تلاش کرنا ہے اور تمام تر لوازم کے ساتھ اپنے الفاظ میں بیان کرنا ہے۔ یہ خیال بالکل صداقت پر مبنی ہے۔ میں ایک تنقید کے طالب علم کی حیثیت سے اس مفروضے سے کلّی اتفاق رکھتی ہوں۔ سماج میں جو کچھ پیش آتا ہے حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنے دور کی صداقت ہوتا ہے۔ افسانے یا کہانی کا بیانیہ پس منظر میں پوشیدہ حقیقت وصداقت کو سامنے لانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

شہناز آپا کے بہت سے افسانوں میں مشرقی ومغربی تہذیب کا تصادم ملتا ہے۔ ہم واقف ہیں کہ ہر تہذیب کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جو اُسے ماضی سے حاصل ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ ہر تہذیب کا تاریخ کے پس منظر میں ارتقاء ہوتا ہے۔ Earl Toimby ارل ٹوئمبی، ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے مغرب ومشرق کی تہذیب کی ارتقائی منازل پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ تہذیبیں وقت کے دامن میں پلتی ہیں۔ ''برف میں بنی گڈنڈی''، ''سیاہ سورج'' اور ''کال چکر'' وغیرہ افسانے اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں آخرالذکر دو افسانوں پر ہم آئندہ روشنی ڈالیں گے، فی الوقت ''برف میں بنی پگڈنڈی'' کی مثال اس امر کی تفہیم کے لیے کافی ہے۔ شہناز کنول امریکہ کے اس ماحول میں جہاں سال کے بیشتر مہینوں میں برف پڑتی ہے مگر تمام اشغال بخوبی انجام دیے جاتے ہیں۔ وہاں کے مقیم اس ماحول کی عادی ہیں اور اس سے لطف اندوز بھی ہوتی ہیں۔ کرسمس کے موقعہ پر جو شدید سردی کا زمانہ ہے پیٹر اور ان کی بیوی کیرولینا اپنا تیوہار منانے کی پوری تیاریاں کرتے ہیں۔ وہ تنہائی سے جنگ نہیں کرتے، کسی قسم کا شکوہ بھی نہیں کرتے، محض اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں، اُن کی زندگی کا ایک خاص انداز ہے اور وہ اُسے ایسے ہی گذارتے ہیں۔ مشرق کی طرح وہاں بھرے پُرے گھر نہیں ہوتے۔ شہناز کنول اپنے دادا انصار کو یاد کرتی ہیں۔ عید کا موقع ہے، دادا انصار سب کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے اس کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ تمام گھر والے مختلف اشیاء کی خریداری کرتے ہیں۔ یہاں پیٹر اور کیرولینا اپنی خوشی کسی سے نہیں بانٹتے لیکن پھر بھی ان کے جوش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ مغربی تہذیب بہرحال انسانی اقدار سے خالی نہیں، یہ اقدار مذہب سے حاصل ہوتی ہیں۔ ''ایک سفید دن کا سیاہ سورج'' اور ''کال چکر'' کی مثال اس ضمن میں بھی دی جاسکتی ہیں۔ تہذیبوں کا یہ تقابل اُن کے افسانوں میں ان کے سفر ناموں سے ماخوذ ہے۔

شہناز کنول کے تجریدی افسانے اُنھیں دوسری خواتین افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ ان کے یہ افسانے منفرد ہیں۔ بادی النظر میں یہ کہانیاں انشائیہ لگتی ہیں نیز اس لیے بھی انشائیہ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ وہ

موضوعاتی ہیں۔ افسانے میں عام طور پر موضوع نہیں مرکزی خیال (Theme) ہوتا ہے، جس کے سبب افسانے کا اہم جز وحدت تاثر پیدا کرتا ہے۔ان کی نوعیت موضوعاتی اور انشائیہ ہونے کے باوجود لوازم کے اعتبار سے یہ تجریدی کہانیاں افسانے ہیں۔شہناز کنول کے افسانوں میں عام طور پر فکری عنصر ہوتا ہے، مگر ان افسانوں میں یہ بدرجۂ اتم موجود ہے ان کا ہر جملہ فلسفیانہ ہے۔ان تمام افسانوں میں شہناز آپا انسان کے سفر اور تہذیب کے تنزل کو بیان کرتی ہیں۔عصر حاضر کی ہرس وطمع، جرائم کا رجحان اور انسان کی خود فراموشی گویا اس کا بھول جانا کہ وہ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود زوال کی کس منزل پر ہے اور اس میثاق کو بھی بھول گیا ہے جو اس نے اپنی پیدائش کے وقت اپنے خدا سے کیا تھا۔اُن کے مجموعے ''دل کی زمین'' میں ایسے چار افسانے ہیں (1) کال چکر (2) ایک سفید دن کا سیاہ سورج (3) نوشتۂ ہست و بود (4) ایک روشن دن کے سراغ میں۔ تجریدی ہونے کے سبب یہ تمام افسانے بنیادی اعتبار سے علامتی ہیں۔ان میں کہیں کہیں تلمیحات بھی ہیں۔ ''نوشتۂ ہست و بود'' میں ذرّہ انسان کی علامت ہے، اس لامتناہی آفاق میں انسان کی حیثیت محض ذرّے کی ہی ہے جو مستقل سفر میں ہے اور بہت سی منازل سے گذرتا ہوا اپنے خالق سے جا ملتا ہے جہاں وہ خود لامتناہی ہو جاتا ہے۔شہناز آپا کا یہ تصور خالص مذہبی ہے جو انھیں ورثے میں ملا ہے۔لیکن انھوں نے اس کو نہایت عمدگی اور خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

اُن کا ایک اور افسانہ ''ایک سفید دن کا سیاہ سورج'' عصری مسائل سے متعلق ہے۔ میرے خیال میں آج کی دنیا میں سائنسی اور تکنیکی ترقی ہوئی ہے اس نے انسان کو یقیناً بہت سے فائدے پہنچائے ہیں۔اس کی بدولت وہ چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے لیکن شعوری اعتبار سے اُسے خسارہ ہوا ہے اس کی تمام تر ایجادات و معلومات روشنی کے بجائے تاریکی میں دھکیل رہی ہیں۔علم و تفکر کے اعتبار سے وہ پہلے سے زیادہ غریب ہے اور اپنے زمانے کی تاریکی کو دور کرنے میں ناکام ہے۔ سیاہ سورج تاریکی کی علامت ہے۔افسانے کے آخر میں ایک فرد جو چشم بینا رکھتا ہے، لوگوں کی گھبراہٹ دور کرتا ہے اور وہ جس کو سیاہ سورج سمجھ رہے ہیں، روز مرّہ کا چمکنے والا سورج ہے جو روشنی پھیلاتا ہے، تاریکی نہیں۔ ہماری تہذیب ترقی کے باوجود اس روشنی سے محروم ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں ان کی مراد لامذہبیت کے رجحان سے ہے۔ مختصراً شہناز آپا کا یہ افسانہ متن کے اعتبار سے نہایت پیچیدہ ہے۔ واضح رہے کہ پیچیدگی از خود جمالیاتی فعلیت ہے۔ اس کے سبب یقیناً افسانے میں تجریدیت کا عنصر حاوی ہے۔ افسانے کے متن کی فکری سطح بھی بلند ہے۔اس میں وہ بہت سے فکر انگیز جملے لکھتی ہیں نیز یہاں پر تاریکی سے پیدا ہونے والی گھٹن کی کیفیت کو بھی بلیغ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ان کا افسانہ ''کال چکر'' وقت کے فلسفے پر لکھی ہوئی اچھی کہانی ہے۔اس افسانے میں بدھ مت کے فلسفے سے استفادہ کیا گیا ہے۔اور واضح کیا ہے کہ انسان وقت کے تصور سے باہر نہیں نکل سکتا۔افسانے کا ہیرو کال چکر سے باہر جانے اور اس سے نجات پانے کی کاوش میں ناکام ہے۔ یہاں اُسے مختلف تجربات ہوتے ہیں وہ ایسی دنیا کی سیر کرتا ہے جو حال، ماضی اور مستقبل کے حصار میں بسی ہوئی ہے، یہ ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔ یہاں مصنفہ نے مختلف مابعد الطبیعاتی عوالم (1) مایا موہ (2) ناری موہ (3) کھادیہ موہ کے حوالے سے تخلیق کیے ہیں۔عربی، فارسی اور اردو ادب میں تصوف کے حوالے سے ان تخیلاتی عوالم پر گفتگو کی گئی ہے اور مختلف تخلیق کاروں نے ان عوالم کو اپنے اعتبار سے کبھی ارتقا اور کبھی تنزل کے حوالوں سے پیش کیا ہے۔ تصوف میں ان عوالم کو ملکوت ، جبروت اور لاہوت سے تعبیر کیا ہے۔اس افسانے کا ہیرو مختلف بستیوں کی سیر کرتا ہے لیکن اسے وہاں موکش کا راستہ نہیں ملتا بلکہ زوال دکھائی دیتا ہے۔ مصنفہ کے خیال میں ان عوالم میں انسانیت مجروح ہوئی ہے اور وقت کے جال میں پھنس کر نفسا نفسی اور کسمپرسی کی حالت پیدا ہو گئی ہے۔افسانے کا ہیرو اپنے مقصد میں ناکام ہے۔ بدھ مت کے راستے پر چلنے کے باوجود وہ موکش حاصل نہیں کر سکتا۔وقت ایک ابدی قوت ہے، خواہشات انسان کی فطرت ہیں، ہاں صرف اتنا ممکن ہے کہ وہ بھی خواہشات پر قابو رکھے اور اپنی ملکی قوت کو بروئے کار لائے۔بس یہی نجات کا ذریعہ ہے۔افسانے کا مرکزی کردار جہاں سے چلا تھا پھر وہیں پہنچ جاتا ہے یعنی ابدی حقیقت سے باہر نکلنا بعید از امکان ہے۔

''ایک روشن دن کا سُراغ'' بھی اسی قبیل کا افسانہ ہے۔ کبیر اس افسانے کا مرکزی کردار ہمیشہ کوشاں رہتا ہے کہ وہ لوگوں کو روشنی دکھائے لیکن اس کی ملاقات ایک ایسی جماعت سے ہوتی ہے جو روشنی کے سراغ میں مصروف سفر ہے لیکن اب تک اُسے تاریکی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ ہمارے خیال میں یہاں بھی تہذیب کی پستی و بلندی کا تصادم ہے۔ روشنی بانٹنے والا کبیر بھی اس جماعت کے ساتھ سفر پر روانہ ہو جاتا ہے، یہاں بھی مذہب ہی رہنمائی کرتا ہے۔ شہناز کنول کے افسانوں میں تہذیبی عناصر کا زوال اور مذہب کی رہنمائی کا تصور جا بجا موجود ہے۔

ادب و جمالیات کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ یہ کہنا غلط نہ

ہو گا کہ جمالیاتی حسیت کے بغیر ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ اس میں نظم ونثر کا کوئی امتیاز نہیں۔ فن پارہ وہی باقی رہتا ہے، جس میں جمالیاتی حسیت موجود ہو۔ یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ جمالیات محض حسن و فنکاری سے بحث نہیں کرتی۔ اس کی مختلف جہتیں اور اقدار ہیں وہ حسن و قبح دونوں سے متعلق ہے نیز اُن سے پیدا ہونے والے جذبات واحساسات سے بھی بحث کرتی ہے، مسرت وانبساط کے ساتھ ساتھ غم واندوہ بھی اس کی وسعت میں شامل ہیں۔ شہناز کنول کے افسانوں میں جمالیاتی فعلیت، حسیت اور اقدار بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جمالیات کی بالخصوص تین قدریں ہوتی ہیں یعنی حسن، نیکی اور صداقت۔ مصنفہ کے مختلف افسانوں کا مطالعہ کرنے پر ہمیں یہ اقدار نظر آتی ہیں۔ مثلاً اُن کا افسانہ ''سودا'' جو کہ پیری مریدی سے متعلق ہے کی ہیروئن نسیمہ مولوی زوّار کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر ہرس وطمع میں گرفتار ہو جاتی ہے اور اپنی غربت وتنگ دستی پر افسردہ رہتی ہے اس کا شوہر مولوی زوّار کے راز سے واقف ہے وہ شہر جا کر وہیں کاروبار اختیار کر لیتا ہے اور اپنی بیوی کو تمام آسائشیں وزیورات جن کی وہ عرصے سے متمنی تھی فراہم کرتا ہے لیکن نسیمہ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود اس زندگی سے خوش نہیں ہے اور پھر سے اپنے پرانے ماحول میں لوٹ جانے کی تلقین کرتی ہے۔ مولوی زوّار کا ماحول ایک نوع کی برائی ہے اور اس کا غربت وتنگ دستی کا ماحول نیکی ہے۔ اسی طرح ایک اور افسانہ ''آئینہ روبرو'' کی مرکزی کردار اپنے ماضی میں عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ کلب، پارٹی اور عمدہ لباس۔ غرض کہ تمام عیش اسے مہیا ہیں لیکن کشمیر آ کر بچوں کی غربت دیکھ کر وہ ان کی زندگی سے متاثر ہوتی ہے اور ان کی مدد کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے اس کی عیش وعشرت کی زندگی ایک اعتبار سے قبح ہے اور غریبوں کی مدد کرنا نیکی ہے اسی طرح دیگر افسانوں کا بھی تجزیہ کیا جا سکتا ہے، فی الوقت ہماری دلیل کے اثبات کے لیے یہی کافی ہے۔

شہناز کنول کے متعدد افسانوں میں احساسات و جذبات و کیفیات کا خوبصورت بیان ہے۔ اس میں شدت بھی ہے اور مسرت بھی۔ بیان کیا گیا کہ مسرت جمالیاتی فعلیت ہے، جس سے حظ حاصل ہوتی ہے۔ مصنفہ کے بیشتر افسانوں میں مسرت کا احساس موجود ہے۔ اس ضمن میں ''آئینہ اور عکس''، ''رشتوں کے قیدی''، ''تمھارے لیے'' اور دیگر افسانوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔ مذکورہ افسانوں میں مسرت وانبساط کی کیفیت بھی ہے اور غم واندوہ کی بھی۔ مختصراً شہناز آپا کے افسانوں میں جمالیاتی حسیت موجود ہے۔

افسانے کے مطالعے کی دوسری جہت ہیئت ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مواد و ہیئت دونوں ہی افسانے کی شناخت میں اہمیت رکھتے ہیں۔ ہیئت اس صنف کی خاص پہچان ہے جس کے تحت اسے کہانی کی دوسری اشکال سے الگ کیا جاتا ہے۔ انھیں ہم افسانے کے لوازم کہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خاص حسب ذیل ہیں۔

(1) پلاٹ (2) کردار سازی (3) فطری مناظر (4) ماحول (5) مکالمے (6) تناؤ (Conflict) (7) وحدتِ تاثر (8) تجسس وغیرہ۔ شہناز کنول کے افسانوں میں یہ تمام لوازم موجود ہیں۔ لیکن کہیں کہیں ان سے تھوڑا بہت انحراف بھی ملتا ہے، جو ان کی انفرادی شناخت ہے۔

کردار سازی افسانے کا اہم لازمہ ہے۔ تمام افسانہ نگاروں کے یہاں یہ خصوصیت موجود ہے۔ شہناز کنول کے یہ کردار اسی دنیا کے جیتے جاگتے انسان ہوتے ہیں جو آج کے مسائل کا سامنا کرتے ہیں۔ ان میں پورے طور پر حصہ لیتے ہیں گویا ان کے کردار زندگی سے بھرپور ہیں اور اپنی فطرت کے مطابق مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ افسانے کا تانا بانا اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ یہ کردار مصنف کے ترجمان نہیں ہوتے۔ مسرت و انبساط، غم واندوہ اور دیگر جذبات واحساسات ان کے اپنے ہوتے ہیں اور کہانی کے مطابق وجود میں آتے ہیں۔ کہانی کا ارتقاء بھی انھیں پر مبنی ہوتا ہے۔ شہناز آپا کے کردار کہیں بھی غیر فطری نہیں معلوم ہوتے، اس ضمن میں ''رشتوں کے قیدی'' کی مثال دی جا سکتی ہے، جس میں زرینہ کا کردار زندگی کی مختلف منازل طے کرتا ہے۔ خوش وخرم رہنے والی زرینہ پر شوہر کے انتقال کے بعد غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے وہ اس کا بھی سامنا کرتی ہے۔ اسی افسانے میں اس کی ایک دوست ہے جو دوسروں سے مختلف ہے، وہ زرینہ میں ہمت پیدا کرتی ہے اور غم واندوہ سے باہر آنے کی تلقین کرتی ہے، دوسروں کی طرح اس پر ترس نہیں کھاتی۔ شہناز کنول کی اکثر کہانیوں میں کردار بیانیہ سے متعین ہوتے ہیں، یہ بیانیہ مصنف کا پیغام ہوتا ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ شہناز آپا کے افسانوں میں بہت سے کردار نہیں ہوتے اکثر ایک ہی کردار کہانی کا محور ہوتا ہے۔ تجریدی افسانوں میں مجمع یا جماعت بھی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''ایک سفید دن کا سیاہ سورج''، ''ایک روشن دن کے سراغ میں'' اور ''کال چکر'' اس کی واضح مثالیں ہیں۔

فطری مناظر شہناز کنول کے افسانوں کی روح ہیں۔ ''برف میں بنی پگڈنڈی''، ''واپسی'' اور ''آئینہ روبرو'' میں یہ مناظر بخوبی بیان کیے گئے ہیں، ان کے مطالعے سے اس کا اثبات ہوتا ہے۔ تجریدی افسانوں میں حالات کے مطابق مناظر غیر فطری ہیں مگر انہی سے تجریدیت کا عنصر پیدا

ہوتا ہے اور انہی کے سبب انسانوں میں ایک نوع کی گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے جس کا آخر میں تدارک ہوتا ہے۔ علم وفکر رکھنے والا کردار جماعت کو فطرت کی طرف راجع کرتا ہے۔ ''آئینہ روبرو'' میں مختلف مقامات پر کشمیر کے بہترین فطری مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح شہناز کنول کے افسانوں میں یہ عنصر بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

شہناز کنول کے افسانوں کا ماحول اکثر گھریلو ہوتا ہے۔ صرف تجریدی افسانے اس سے الگ ہیں۔ ان کا ماحول کائنات اور پس منظر انسانی تہذیب ہے۔ اس کے علاوہ افسانے کے دوسرے لوازم کو بھی خوبی سے برتا گیا ہے۔ شہناز آپا کے افسانوں میں تناؤ سماجی اور مابعد الطبیعاتی سطح پر ہے۔ سماجی تناؤ عام طور پر تہذیبی نوعیت کا ہے۔ کہیں احساسات و جذبات کا بھی تناؤ دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افسانے ''رشتوں کے قیدی'' کی کردار زرینہ نفسیاتی تناؤ کا شکار ہے۔ ملنے جلنے والی عورتیں اُس کے اس ذہنی تناؤ میں اور اضافہ کرتی ہیں۔ دیگر لوازم کے ساتھ ساتھ شہناز کنول کے افسانوں میں تجسس (Suspense) اور وحدت تاثر کے عناصر بھی موجود ہیں۔ ان کے افسانوں کے طائرانہ مطالعے سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ ان دونوں عناصر کے سبب قاری کو ان کے افسانوں میں ایک نوع کی کشش محسوس ہوتی ہے اور اس کا ردِّعمل مثبت ہوتا ہے۔ افسانوں کے متن کا قاری پر دیرپا اثر ہوتا ہے۔ مختصراً شہناز کنول کے افسانے عصر جدید کی بہترین کہانیاں ہیں۔ مواد اور ہیئت دونوں کے مطابق یہ افسانے مکمل ہیں۔ تجریدی افسانے ان کی انفرادیت ہے۔

ہم نے یہاں شہناز کنول کے افسانوں کا مختصر تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ افسانوں کے علاوہ انھوں نے کئی ناول اور سفرنامے بھی لکھے ہیں۔ شہناز آپا کی زبان نہایت شستہ ہے وہ الفاظ تلاش نہیں کرتیں بلکہ موقع ومحل کے اعتبار سے الفاظ خود بخود ان کی نوک قلم پر آجاتے ہیں۔ ان کی زبان کی خاص بات یہ ہے کہ وہ مشکل پسندی سے گریز کرتیں ہیں۔ ان کی لفظیات کرداروں اور ماحول کے مطابق ہوتی ہے۔ کہیں کہیں وہ مختلف اصنات، تشبیہ واستعاروں کا بھی استعمال کرتی ہیں ان کی خصوصیت ہے کہ تجریدی اور علامتی افسانوں میں بھی ان کی زبان گنجلک نہیں ہوتی۔ تشبیہات واستعارات بھی بعید نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں پیکریت بھی فطری ہے گویا وہ زبان پر پوری قدرت رکھتی ہیں۔

بیان کیا گیا ہے کہ ان کے افسانوں کے کردار جیتے جاگتے ہوتے ہیں ان میں کوئی عینیت یا تصوریت نہیں ملتی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے افسانوں میں عصری آگہی کا عنصر موجود ہے۔ وہ موجودہ سماج کے مسائل پر بات کرتی ہیں۔ ان کی یہ بھی کوشش نہیں ہوتی کہ ان کے کردار نقائص سے پاک ہوں یعنی وہ ہیرو کے قدیم تصور سے اتفاق نہیں کرتیں۔ واضح کیا گیا کہ ان کے افسانوں میں اکثر تہذیبی تصادم نظر آتا ہے۔ انھوں نے مغرب ومشرق کی تہذیب کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے افسانوں میں جابجا ان کا تقابل بھی کیا ہے۔ یہ عنصر بھی ان کی انفرادیت کا امین ہے۔ ہم عصر افسانہ نگاروں میں ہمیں اکثر یہ عنصر نظر نہیں آتا نیز وہ اپنی تہذیب اور اپنی شناخت کی بھی ضامن ہیں۔ وہ ان کی اقدار کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ مذہبی ہونے کے باعث وہ اپنے ورثے پر نازاں ہیں اور اس کو تہذیبی تشخص کے لیے لازمی سمجھتی ہیں۔

ناول، افسانے اور سفرناموں کے علاوہ انھوں نے بہت سے خاکے بھی لکھے ہیں۔ شہناز آپا کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے ان کی تمام نثری اصناف کا جائزہ لینا ضروری ہے لیکن ان میں سے ہر ایک پر الگ مضمون درکار ہے۔ علی گڑھ میں بالخصوص خواتین میں کئی اور افسانہ نگار موجود ہیں۔ لیکن شہناز آپا کا مقام سب سے بلند ہے وہ ایک کہنہ مشق ادیبہ ہیں۔ زبان وبیان پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ بیسویں صدی کے بہت سے افسانہ نگاروں سے واقف ہیں۔ ان میں سے کچھ سے انھوں نے استفادہ بھی کیا لیکن وہ نقل کسی کی نہیں کرتیں ان کا اپنا اسلوب ہے جو نہایت مؤثر ہے۔ ان کے افسانے قاری کو باندھ کر رکھنے میں کامیاب ہیں وہ جس مسئلہ پر بھی قلم اٹھاتی ہیں اس کے ساتھ پورا انصاف کرتی ہیں۔

کتابیات

(1) اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، از۔ پروفیسر صغیر افراہیم

(2) اردو افسانہ تعریف، تاریخ اور تنقید، از پروفیسر صغیر افراہیم، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی

(3) اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید، از۔ ڈاکٹر پروین اظہر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

(4) اردو افسانہ روایت اور مسائل، مرتبہ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

□□□

Dr. Syeda Narjis Fatima
Hamid Ali Building
Shamshad Market
Aligarh-202002 (U.P)

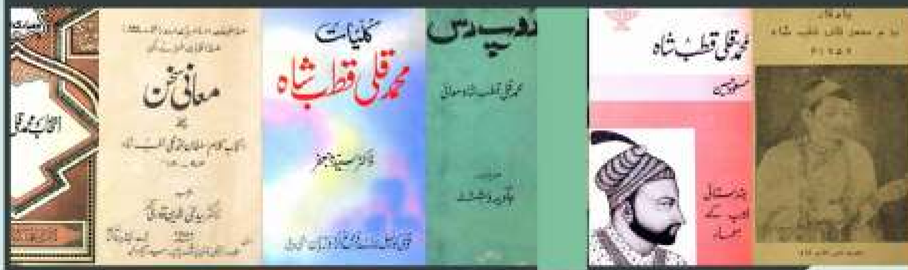

ڈاکٹر تسنیم بانو

محمد قلی قطب شاہ

اور ان کی بارہ پیاریاں

بہمنی سلطنت کے زوال پذیر ہونے کے بعد اس سلطنت سے پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں ۔گول کنڈہ میں قطب شاہی، بیجاپور میں عادل شاہی، احمد نگر میں نظام شاہی، برار میں عماد شاہی، بیدر میں برید شاہی۔

قطب شاہی سلطنت کا بانی قلی قطب شاہ ترکستان کے قراقویوں سے تعلق رکھتا تھا، بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرتے ہی تمام صوبہ دار سلطان بن بیٹھے تو تلنگانہ کے صوبہ دار بھی سلطان بن کر قطب شاہ کہلائے ۔1518 میں یہ سلطنت وجود میں آئی اور اپنی سلطنت کا نام قطب شاہی رکھا۔ ''سلطان محمد قلی قطب شاہ'' قطب شاہ سلطنت کے پانچویں بادشاہ ہوئے۔ ان کی پیدائش 14 اپریل 1565 بمطابق 14 رمضان المبارک 978 مانی جاتی ہے۔ یہ اپنے والد کے انتقال کے بعد 15 سال سے بھی کم عمر میں تخت نشیں ہوئے۔ ان کی حالات زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت ہی غریب پرور بادشاہ گذرے ہیں جنھوں نے غرباء کی دادرسی کے لیے ایک محل بنوایا تھا جس کا دروازہ ہر غریب و مفلس کے لیے کھلا رہتا تھا اور بادشاہ خود ان کی فریاد سنتے اور ان کی امداد کرتے تھے۔ بادشاہ غرباء پروری کے ساتھ ساتھ عاشق مزاج بھی تھے اور فارسی، اُردو میں بھی شاعری کرتے تھے، گویا بادشاہ کی مادری زبان تلنگی (تلنگو) تھی لیکن وہ اپنے وقت کے اردو کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں ۔ان کے اردو دیوان میں پچاس ہزار سے زائد اشعار موجود ہیں۔ انھوں نے 17 تخلصات استعمال کیے ہیں۔ محی الدین زور نے اس بارے میں لکھا ہے۔ ''معلوم ہوتا ہے سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اصل میں اردو شاعری کے لیے معانی، فارسی کے لیے قطب شاہ اور تلنگی کے لیے ترکمان تخلص اختیار کیے تھے۔'' (ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ)

محمد قلی قطب شاہ کے اس ضخیم دیوان کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ دوسرے حصے سے ضخیم ہے۔ پہلے میں صرف نظمیں ہیں ۔ان کے عنوان نہیں ہیں کیونکہ تب عنوان کا رواج نہیں تھا، سیدہ جعفر خود لکھتی ہیں:

> ''صحیح ہے کہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود محمد قلی قطب کے کلیات کے دونوں نسخوں میں ہمیں عنوان نظر نہیں آتا بلکہ مختلف موضوعات پر محمد قلی نے جو مسلسل غزل نما نظمیں کہی ہیں وہ منتشر حالت میں ادھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں۔ ان میں نہ ترتیب و توازن ہے اور نہ موضوع کی ارتباط کا احساس...... نظموں کے عنوانات اور اشعار کے معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے..... ایسی سرخیاں قائم کی گئیں جو اشعار معنویت سے مکمل مطابقت رکھتی ہوں۔''

(مقدمہ قلی قطب شاہ۔ صفحہ 292.293)

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ بادشاہ عاشق مزاج بھی تھا اس کی عاشق مزاجی کا ثبوت اس کی ، بارہ پیاریوں سے ملتا ہے۔ جس سے یہ اپنے عہد کا بارہ پیاریوں کا عاشق شاعر کہلواتا ہے۔ مثال کے لیے ان کی پیاریوں میں سے کچھ خاص نام اس طرح ہیں۔

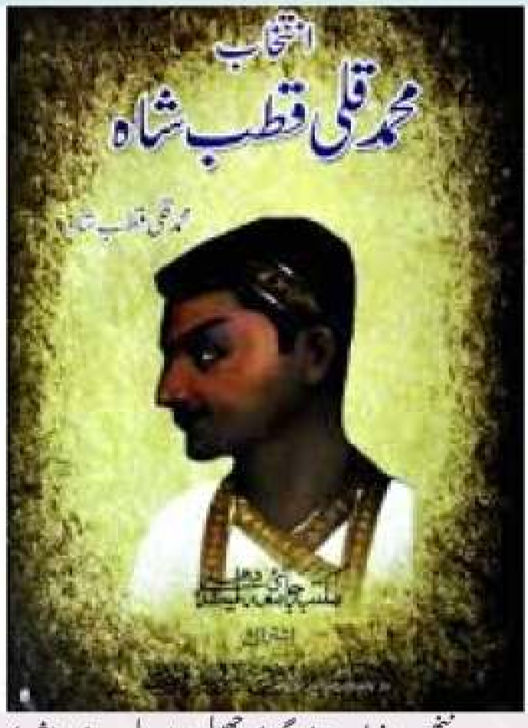

ننھی ، سانولی ، پیاری ، گوری ، چھبیلی ، لالہ ، لالن ، موہن ، مشتری ، محبوب اور حیدر محل ہیں ۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی حسینائیں ان کی محبوب نظر تھیں ، جن میں خاص محبوب نام اس طرح ہیں ۔ بلقیس ، زمانی ، حتم ، پدمنی ، رنگیلی ، سندری وغیرہ اہم ہیں ۔ لیکن مذہب کی رو سے بارہ زیادہ عزیز تھیں ۔ جیسا کہ جمیل جالبی تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں :

''محمد قلی نے اپنی شاعری میں جن کا ذکر سب سے زیادہ کیا ہے وہ اس کی بارہ پیاریاں ہیں حالانکہ اس کی بیسوں محبوبائیں تھیں ۔ محلات کے علاوہ انیس کا ذکر بڑے پیار سے کیا ہے ۔ اور ان میں بھی بارہ اماموں کی رعایت سے بارہ زیادہ عزیز تھیں ۔''

(تاریخ ادب اُردو جمیل جالبی صفحہ 314)

اس لحاظ سے دیکھیے ان کی شاعری کے چند اشعار :

''پیاری کے مکھ پیا نے کھیلنا بسنت
پھولاں حوض تھے چر کے چھڑیا بسنت
بسنت باس چن چن کے چتر پسند ہے
جواہر کے لہراں سوں آیا بسنت
جو بن حوض میں نو رتن رنگ بھرے
بسنت راگ گاؤ آیا بسنت''

گویا محمد قلی قطب شاہ نے اردو شاعری کو نیا رنگ و آہنگ اور وسعت بخشی جس کے سبب اردو شاعری دنیا کی عظیم ترین زبانوں کی صف میں آ کھڑی ہوئی میدان شاعری جو اکثر و بیشتر مذہبی امور کے لیے وقف تھیں اس کے دامن کو انھوں نے اتنا وسیع کیا کہ اب اس میں ہر موضوع جذب کرنے کی قوت آ گئی ۔ دیکھیے محی الدین زور کے الفاظ میں :

''یہ واقعہ ہے کہ قطب شاہ نے اردو شاعری کو بالکل نئی طرح سے مرتب کر دیا ہے۔ اس سے قبل زیادہ تر مذہبی نظمیں لکھی جاتی تھیں۔ اس نے ہر قسم کے موضوعات پر طبع آزمائی کی اور اردو شاعری کے لیے میدان عمل پیدا کر گیا۔''

(مقدمہ قلی قطب شاہ ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۔ صفحہ 567.65 ۔ 1960ء)

اس وسیع راستے کی دو شاہراہیں اول مذہبی امور پر طبع زاد نظمیں جس کے لیے بڑا وسیع میدان تھا اور جس پر اس سے قبل کے شعراء ، صوفیا سے بھی نظمیں لکھتے چلے آ رہے تھے ۔ دوم بادشاہ کی عاشق مزاجی اور حسن پرستی نے اس حسن پرست تموج کو تیز تر کر دیا جس کے سبب اشعار میں نکھار و وارفتگی پیدا ہوئی ۔ اس خیال کو ہم سیدہ جعفر کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں جو اس طرح ہیں :

''محمد قلی قطب شاہ کے دو قوی محرکات رہے ہیں یا تو مذہبی عقائد اور مذہبی تقریب نے ان کو شعر کہنے کی طرف مائل کیا یا پھر حسینوں کے ناز و ادا نے ان کے جذبات میں تلاطم پیدا کیا ہوا اور جذبات کے اسی تموج نے اس کو شعر کی صورت میں پیش کیا ہے''

(مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ صفحہ 121 مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر 1998ء)

ان کے کلام میں حسن پرستی کی چند مثال ملاحظہ فرمائیں :

بسنت کھیلیں عشق آ پیارا
تمھیں ہے چاند، میں ہوں ستارا
منچھل کنون کے تاراں ایک چھو نا
بندی ہوں چھند بند سوں کر سنگرا
چیا نگ پر ملاکر لیائی پیاری
بسنت کھیلی ہوا انگ سنگارا

بسنت دنت جھد سو کندن گال اوپر
بھولایا آگ کیسر کی بہارا

عشقیہ نغموں سے ان کا دیوان بھرا ہے۔ان میں سے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:

میری سانولی من کی پیاری دیسے
کہ رنگ روپ میں کوئلی ناری دیسے
پہنے سب سہیلیاں کونوں میں بالی جب
سر و قد ناری، اوتاری دیسے

یہ نمونہ تھا شاعر کے حسن وعشق پرستی کا اب ذرا شاعر کے مذہبی جذبے کا جائزہ اسی کے کلام کے چند نمونوں سے لیتے ہیں۔مناجات کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مناجات میرا تو سن یا سمیع
مجھے خوشی تو رکھ یا سمیع
بھلا کر بھلا مجھ سوں جو ہوئے گا
برا کر برا منج سوں جن یا سمیع
میرے دوستاں کو نت دے جنت
میرے دشمناں کو ں اگن یا سمیع

محمد قلی قطب شاہ جشن عید میلاد النبیؐ نہایت دھوم دھام سے مناتے اور نعتیہ کلام بھی پیش کرتے تھے۔نعتیہ کلام کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

''گنائے نبیؐ کے جو مولود انداں
ہمسایوں محمد قطب شہ تر کمسان
سنوارے جگت سب جنت پرت سوں
نگارے جو بازار قصراں محلاں
سنگار آویں حوراں نمن ہر طرف تھے
مرصّع میں ڈُب سر تھے گپ نوری تاراں''

اہل بیت اطہار کو خراج عقیدت پیش کرنے میں قلی قطب شاہ کا کوئی ثانی نہ تھا اور انھوں نے بارہ اماموں کی شان میں شاندار نظمیں رقم کی ہیں۔مولا علیؑ کی شان میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

''دنیا ودیں کا حق سنگار یا علیؑ توں
سب اولیا کے من کا اسرار یا علیؑ توں
سورج تو تو انبر کا دیوا تو دین گھر کا
پیارا تو پیغمبر کا سچ یار یا علیؑ توں
غلاماں پشر جملا رے قربان تج پہ سارے
سب مدعا ہمارے بر آر یا علیؑ توں''

حسن وعشق، مذہب ودین کے علاوہ دیگر موضوعات جیسے موسم بہار، موسم برسات تیوہاروں وغیرہ پر کثیر تعداد میں اور بلند مرتبت کی نظمیں بھی لکھی ہیں گویا انھیں اصناف اور مختلف موضوعات پر دسترس حاصل تھی۔ برسات کے موسم پر ان کی 14 نظمیں ہیں جس میں بارش کی آمد کے جشن کی تصویر کشی بہترین انداز میں کی ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

روت آیا کلیاں کا ہوا راج
ہری ڈال سر پھولاں کے تاج
کیسی پھول دیسے ستارے آسماں
اس زمانے کی پری پدمنی آئے آج
چو ندھیر گرجت ہو رمینھوں برست
عشق کے چمنے چمن موراں راج

قلی قطب شاہ سے قبل زبان اردو کی شاعری صوفیانہ اشعار میں بکھری ہوئی ملتی ہے۔نہ کوئی پختگی نہ کوئی اہم مجموعہ کلام ملتا ہے البتہ فارسی اور دیہی بولی میں چند صوفیائے کرام کے اشعار پائے جاتے ہیں۔قلی قطب شاہ وہ پہلے شخص ہیں جو اردو زبان وکلام کو مجموعی صورت میں پیش

کر کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہونے کے حقدار بنے۔

جیسا کہ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''قلی قطب شاہ پہلے شخص ہیں جن کا کلام مجموعی صورت میں موجود ہے۔ ان کی زبان میں کافی پختگی پائی جاتی ہے........ مختصراً یہ کہ قلی قطب شاہ ان لوگوں میں سے ہیں جو سب سے پہلے اپنے کلام کی تدوین کی اور اردو کو ایسا وسیع کیا کہ آئندہ وہ ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہوگئی۔''

(تاریخ ادب اردو)

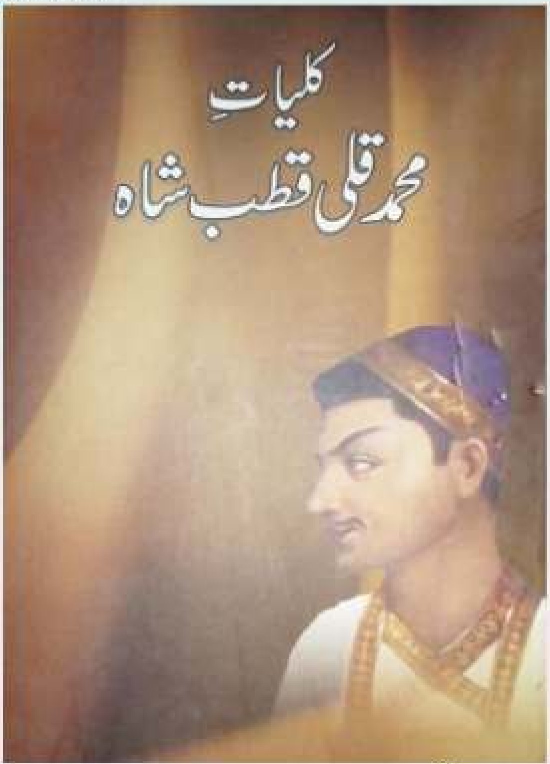

جب کسی شاعر کے کلام کا جائزہ لیا جارہا ہو اور اس کے زبان و بیان، اسلوب و ہیئت پر بات نہ کی جائے تو ناانصافی سی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے موصوف کی زبان و اسلوب پر بات کریں تو گزرے پچھلے اوراق سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے سادہ سلیس اور عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ حالانکہ آج کے دور کے لحاظ سے الفاظ نامانوس ہیں لیکن زبان اُردو ہی ہے۔ کیونکہ جب ہم قلی قطب شاہ کو اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر گردانتے ہیں تو ظاہری بات ہے اس کی زبان بھی اُردو ہے یہ بات اور ہے کہ موجودہ دور کی زبان اور قلی قطب شاہ کی زبان میں فرق ہے۔ لیکن انسانی شعور اور زبانیں ترقی کی منزلیں طے کرتی رہتی ہیں اور الفاظ داخل و خارج بھی کیے جاتے ہیں۔ زبان اُردو نے بھی بہت سے الفاظ ترک کیے ہیں۔

جہاں تک ہیئت کی بات آتی ہے تو قلی قطب شاہ کے کلام کا بڑا حصہ غزل کی ہیئت میں نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں کو مسلسل غزل بھی کہا جاتا ہے جو اس زمانے کی روش کے مطابق ہیں۔ ان کے کلام کا سب سے بڑا حصہ غزل پر مشتمل ہے اس کے علاوہ انھوں نے مثنوی، رباعی، ترجیع بند، حمد، مراثی اور قطعات تمام طرح کے اشعار پر بڑے اچھے انداز میں شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں۔

اس طرح محمد قلی قطب شاہ کی شاعرانہ عظمتوں، اس کی زبان دانی کی رفعتوں کا جائزہ لیتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ اتنی نوعمری میں حکومت کا انتظام وانصرام، بیسوں پیاریوں سے گہرا معاشقہ، کئی زبانوں کی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو کا اتنا عظیم وضخیم دیوان جس میں پچاس ہزار سے زائد اشعار ہوں اور وہ دو حصوں میں منقسم ہوں۔ جس کا پہلا ضخیم حصہ نظم پر مشتمل ہو اور دوسرا حصہ مختلف شعری اصناف یعنی قطعہ، رباعی، مراثی، مثنوی، غزلیات اور قصائد پر مبنی ہو بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جس نے شاعر کو پہلا صاحب دیوان ہونے کا درجہ عطا کیا۔

غرض یہ کہ محمد قلی قطب شاہ اپنے عہد کا پہلا اردو کا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کی شخصیت پر طائرانہ نظر ڈالنے اور اس کی نظموں میں موجود جذبات وتخیلات پر غور وخوض کرنے پر معلوم ہوا کہ بڑی منت ومراد کے بعد پیدا ہونے والا اکلوتہ شہزادہ، ایک عاشق مزاج شخصیت مالک اور نہایت کمسنی میں تخت وتاج وحکومت کا علمبردار، حسن پرست، عاشق مزاج، صلح جو، مذہب پرست، علم دوست شاعر واقع ہوا۔ البتہ موصوف کی شاعری میں مذہب پرستی اور حسن پرستی دونوں کا امتزاج ملتا ہے اور بابائے ریختہ کے لقب سے سرفراز 1800 صفحات کے دیوان کے اس شاعر نے اردو ادب کے دامن کو اتنا کشیدہ کیا کہ اس میں جدید شاعری کے نمونے وآثار نظر آنے لگے بالآخر اُردو ادب کو نیا رنگ وآہنگ اور نیا تموج عطا کرکے، اپنی محبوبہ حیدر محل کے نام پر حیدر آباد شہر آباد کر کے، سہ متضاد راہوں کا یہ مسافر 1612 میں اس دار فانی سے کوچ کرتا ہے۔

□□□

Dr. Tasneem Bano
C/o Firdaus Akhtar
63/44, Colonelganj,
Allahabad-211002 (U.P.)

ڈاکٹر ارشاد احمد

سیوان ضلع کی خواتین تخلیق کار

زمانۂ قدیم سے ہی صنفِ نازک زندگی اور معاشرے کے تمام شعبوں میں پیش پیش رہی ہیں۔ انسانی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ متعدد خواتین نے سیاست، سائنس، رقص و موسیقی، ادب اور فنونِ لطیفہ جیسی اصناف میں کارہائے نمایاں انجام دے کر تاریخ کے صفحات میں اپنا نام رقم کرنے کے لیے دنیا کو مجبور کیا ہے۔ سرزمین بہار کی تاریخ میں بھی ایسی خواتین کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے مختلف شعبہ جات میں نمایاں خدمات انجام دیں ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

ضلع سیوان صوبہ بہار کا وہ زرخیز خطہ ہے جہاں نہ صرف عظم المرتبت، یکتائے زمانہ اور مشہور دیار و امصار سیاست داں پیدا ہوئے بلکہ ادبا، شعراء، صوفیہ کرام اور علماء عظام کی کثیر تعداد نے سماج، ادب، سیاست اور ثقافت کو نئی سمت و رفتار دینے میں نمایاں رول ادا کیا۔ ڈاکٹر راجندر پرساد، مولانا مظہر الحق، بابو برج کشور پرساد، بابا خلیل داس اور چترگپت جیسے عظیم اشخاص نہ صرف ملک گیر سطح کے ہر دل عزیز رہنما تھے بلکہ تحریک آزادی کے ہراول دستے کے اہم سپہ سالار بھی تھے جن پر گاندھی جی کو اور پورے ملک کو ناز تھا۔ اس ضمن میں طیب النفس خواتین کے کارنامے بھی ناقابل فراموش ہیں۔ فخر کی بات یہ ہے کی سیوان کی سرزمین کو اس میں اولیت حاصل ہے۔ جس زمانے میں سر سید احمد خاں روشن خیال ہوتے ہوئے بھی خواتین کی تعلیم کی مخالفت کرتے تھے اس زمانے میں سیوان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ متعدد خواتین شعر و ادب میں کافی احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی تھیں اور معاصر رسائل و جرائد میں شائع ہوتی تھیں۔ یہاں سیوان کی چند خواتین تخلیق کاروں کا تذکرہ اجمالاً کیا جارہا ہے۔

بی بی سید النساء (1878-1930): بی بی سید النساء بنت محمد بہرام موضع تیتہلی (بڑہریا) ضلع سیوان کے ایک رئیس خاندان میں 1878 کو پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم حسب روایت گھر پر ہوئی۔ انھوں نے پہلے قرآن حفظ کیا۔ اردو کی تعلیم اپنے والد سے اور عربی و فارسی کی تعلیم اپنے چچا حکیم عبدالطیف احمد سے حاصل کی۔ حکیم صاحب رشتے میں سیدہ کے چچا اور خالو لگتے تھے۔ سید النساء کو بچپن سے ہی شعر و ادب میں گہری دلچسپی تھی۔ وہ بہت ہی کم عمر سے ہی شعر موزوں کرنے لگیں۔ بعد میں جب شاعری کا باضابطہ آغاز کیا تو حکیم عبدالطیف احمد سے اصلاح لی۔ رفتہ رفتہ ان کو قطعاتِ تاریخ جیسے مشکل فن پر مہارت حاصل ہوگئی۔ انھوں نے اپنا تخلص "سیدہ" رکھ لیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سیدہ برصغیر کی واحد شاعرہ ہیں جنھوں نے کثرت سے قطعات تاریخ رقم کیے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

سیدہ قطعاتِ تاریخ حالات اور واقعات سے متاثر ہو کر رقم کرتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں عصری حسیت، نسوانی جذبات کی عکاسی اور اہل وطن سے محبت و اپنائیت کے عناصر نمایاں ہونے لگے۔ ان کی تخلیقات معاصر رسائل و جرائد میں شائع ہونے لگیں۔

کچھ دنوں کے بعد وہ لاہور سے شائع ہونے والا خواتین کا مجلّہ 'تہذیب نسواں' کی مستقل قلم کار بن گئیں۔ ان کے پاس 'تہذیب نسواں' کے توسط سے برصغیر کے گوشے گوشے سے قطعہ تاریخ کے لیے فرمائشیں آنے لگیں۔ آپ 1901 سے اپنی وفات 1930 تک تہذیب نسواں میں مسلسل لکھتی رہیں۔ ڈی وقار ڈپٹی نذیر احمد کے لڑکے مولوی بشیر الدین احمد کے یہاں تین بیٹوں کے بعد ایک دختر فرخندہ اختر کی ولادت باسعادت ہوئی تو انھوں نے سیدہ کو خبر دی۔ سیدہ بہت خوش ہوئیں۔ سیدہ نے تاریخ قطعہ کہا:

سال تاریخ کا ہوا جو خیال
میں نے ہاتف سے سیدہ فی الحال
پوچھی تعداد ان کے بچوں کی
تو کہا تین بیٹے اک بیٹی
(1325 ہجری)
دکن سے لے کر دہلی تک جو یہ دھوم
مبارک باد کی ہر سو مچی ہے
کہاں ہے اس کے منہ میں بھر دیں شکر
نوید جاں فزا جس نے دی ہے
کہ یہ چوتھی ولادت باسعادت
بشیر الدین کے گھر میں ہوئی ہے
کچھ اس کے ماسوا اس میں نہیں ہے
کہ بیٹی، تین بیٹوں پر ہوئی ہے
خدائے پاک کی درگاہ میں اب
دعا آٹھوں پہر میری یہی ہے
مجھے تاریخ لکھنے کے لیے بھی
ذرا مہلت نہیں دیتی خوشی ہے
غنیمت سیدہ ہے تو نے جو کچھ
ہجوم شادمانی میں لکھی ہے
بقول مصرعہ سال ہمایوں
ولادت پر ولادت ہو رہی ہے

واضح ہو کہ مولوی بشیر الدین احمد سے حکیم عبدالطیف احمد کے تعلقات دوستانہ تھے۔ ان دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ حیات قائم رہا۔ فصیح الدین بلخی نے اپنی کتاب "تذکرہ نسواں ہند" میں سیدہ کا تذکرہ سرسری طور پر کیا ہے۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ بہار کے دیگر تذکرہ نگاروں نے سیدہ کو اپنے تذکروں میں جگہ کیوں نہیں دی ہے۔ ڈاکٹر محمد مظاہر الحق نے بڑی جانفشانی سے تہذیبِ نسواں کے تمام شماروں کی ورق گردانی کر کے ان کے قطعات اور حالات زندگی پر مشتمل ایک کتاب ''سیدہ اور ان کی تاریخ گوئی'' 1997 میں شائع کرائی۔ اب یہ کتاب نایاب ہو چکی ہے۔

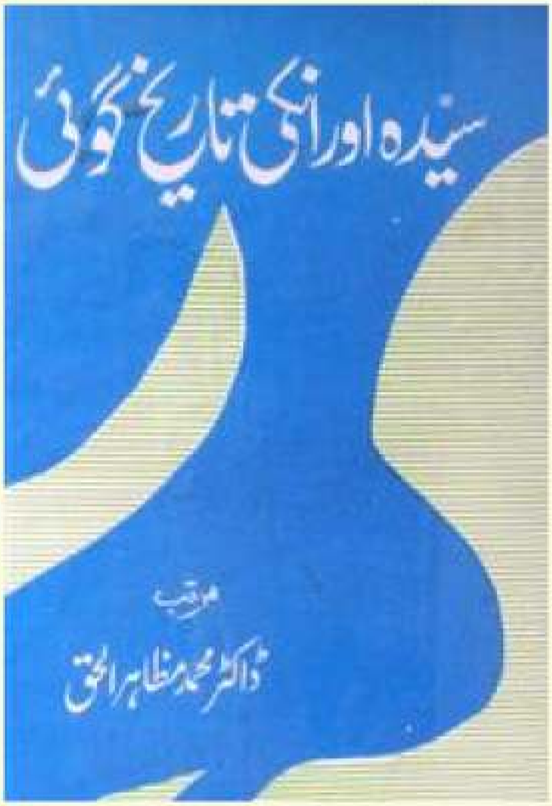

سرور جمال (2013-1936):- سرور جمال کا اصل نام سرور جہاں عرف بکاؤلی تھا۔ وہ سیوان کے معروف و مقبول امیر باوقار حاجی محمد داؤد کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ والد بزرگوار حاجی محمد داؤد علم دوست اور روشن خیال شخص تھے۔ ان کے نام پر داؤد میموریل گرلز ہائی اسکول قائم ہوا جس میں ایک ہزار سے زیادہ طالبات مفت میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ سرور جمال کے گھر میں دولت کی فراوانی تھی، اس لیے ان کی پرورش و پرداخت ناز و نعم میں ہوئی۔ دادی نور جہاں کے دستِ مبارک سے رسم بسم اللہ ہوئی۔ مولوی مصلح الدین نے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم سے آراستہ کیا۔ اس زمانے میں لڑکیوں کو اسکول جانا معیوب سمجھا جاتا تھا اس لیے انھوں نے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں آزاد طالب علم کی شکل میں حاصل کیں۔ پٹنہ سے بی ایڈ پاس کیا اور ایک مقامی اسکول میں بہ حیثیت معلّمہ اپنی خدمات دینے لگیں۔ 11 فروری 1966 کو ان کی شادی اردو

کے مشہور و معروف مزاح نگار احمد جمال پاشا سے ہوئی۔اس کے چند ماہ بعد وہ لکھنؤ منتقل ہو گئیں۔ اسکول کی معلمی سے بھی استعفیٰ دے دیا۔خوشحال ازدواجی زندگی کے درمیان لکھنؤ میں انھوں نے ایم اے (اردو) کا امتحان دیا اور یونیورسٹی میں اوّل مقام حاصل کیا۔اپنے والد حاجی محمد داؤد کے انتقال کے بعد احمد جمال پاشا کے ساتھ سیوان واپس آگئیں۔اسی درمیان ان کی تقرری ودیا بھون مہیلا کالج میں لکچرر کے عہدے پر ہو گئی۔احمد جمال پاشا کی تقرری زیڈ، اے اسلامیہ کالج کے شعبۂ اردو میں ہو گئی۔سرور جمال 1998 میں باسٹھ سال کی عمر میں اپنی ملازمت پوری کر کے کالج سے سبکدوش ہوئیں۔

سرور جمال کا پہلا مزاحیہ مضمون 'اتوار چھٹی کا دن' شائع ہوا۔درس و تدریس سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے قلم میں روانی آئی۔ان کی تین کتابیں بالترتیب مشقِ ستم ،مفت کے مشورے اور اردو قواعد شائع ہوئیں۔ان کا آخری مضمون عمر بن عبدالعزیز ہے جو بچوں کا ماہنامہ امنگ (دہلی) میں شائع ہوا تھا۔

امتیاز فاطمی (1942-2007):-امتیاز فاطمی کا اصل نام امتیاز بانو ہے اور ان کا تعلق خانوادۂ شاد عظیم آبادی سے ہے۔ان کے والد کا نام سید سلطان احمد بہزاد فاطمی تھا جو نبیرۂ شاد تھے۔امتیاز کی والدہ رباب بانو شریف ،ملنسار اور نیک طینت خاتون تھیں۔پٹنہ سیٹی میں پیدائش کے بعد امتیاز فاطمی نے ابتدائی تعلیم شیخ پورہ میں حاصل کی جہاں والد محترم اپنی ملازمت کے سلسلے میں تعینات تھے۔15 مئی 1961 کو ان کی شادی سید خادم حسین اشرف ابن سید انیس اشرف سے ہوئی جو کہ سید ٹولی، حسین گنج، ضلع سیوان (بہار) کے باشندے تھے۔شادی کے بعد بہار یونیورسیٹی مظفر پور سے اردو میں ایم۔اے اور بی۔ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔1974 میں ان کی بحالی اسسٹنٹ ٹیچر کے عہدے پر ہو گئی اور مختلف اسکولوں میں اپنی خدمات انجام دیتے ہوئے گورنمنٹ مڈل اسکول سردوہ، مظفر پور سے 2005 میں سبکدوش ہوئیں۔ان کی پہلی تخلیق ''گناہ سے تعمیر تک'' ماہنامہ عکس (جمشید پور) میں 1974 میں شائع ہوئی۔اس کے بعد ان کی تخلیقات بانو، حریم (لکھنؤ) پاکیزہ آنچل، خاتون مشرق، زریں شعاعیں (شری نگر) صدف (حیدرآباد) قومی تنظیم (پٹنہ) راشٹریہ سہارا اور پندار جیسے رسائل واخبارات میں کثرت سے شائع ہوئیں۔ان کے کل شائع شدہ مضامین اور افسانوں کی تعداد پانچ سو سے زائد ہے۔ان کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ڈوبتی شام (1993)(2) فسانہ خونِ دل کا (2005 انعام یافتہ) اور (3) ایک قطرہ آنسو (2006)۔ماہنامہ شاعر نے ان کی شخصیت اور افسانہ نگاری پر محیط ایک خصوصی شمارہ جون 2006 میں شائع کیا، جسے ادبی دنیا میں کافی پسند کیا گیا۔ ان کی کتابوں پر بہار اردو اکادمی اور اتر پردیش اردو اکادمی نے انعامات دیے ہیں۔ہیرو گروپ کے ملازم اور گروگرام میں مقیم ان کے لڑکے سید معصوم اشرف نے بتایا کہ ایک مضامین کا مجموعہ زیر اشاعت ہے۔ امتیاز فاطمی آل انڈیا ویمنس کلچرل رائٹرس ایسوسی ایشن کی نائب صدر اور ادبی مجلّہ صدف کی اڈیٹر عرصۂ دراز تک رہیں۔2007 میں مظفر پور میں پیوندِ خاک ہوئیں۔

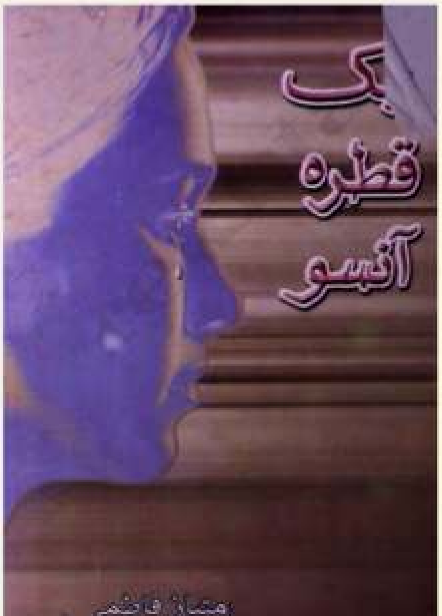

امتیاز فاطمی نے اپنی خاندانی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے افسانوی ادب میں قابل تعریف اور لائق تحسین اضافہ کیا۔انھوں نے ہندوستانی سماج اور معاشرے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا جس میں صنفِ نازک کو اوّلیت حاصل ہے۔ان کا قلم عورتوں کے حقوق ،مسائل اور جذبات کی ترجمانی کے لیے رواں دواں تھا۔ان کے افسانوں کے بیشتر کردار ایسی سادہ دل لڑکیاں ہیں جو حسین زندگی کے سنہرے خواب تو دیکھتی ہیں لیکن انھیں ان خوابوں کی تعبیر کے لیے جہیز اور موٹی رقم کی فرمائش جیسی سماجی لعنتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جس میں ان کی ہار ہوتی ہے۔ان کے افسانوں کے کردار مظلومیت کی ایک درد بھری داستان ہیں جو قاری کے دل دماغ کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ان کے افسانے فنی اعتبار سے بھی پختہ اور بالیدہ ہیں۔

شہناز بانو (پ۔1949):۔ شہناز بانو کا قلمی نام شہناز فاطمی ہے۔ان کی سسرال اور میکے دونوں جگہوں پر اردو ادب کی مضبوط روایت ملتی ہے۔ان کے والد بزرگوار سید سلطان احمد بہزاد فاطمی بہار سرکار میں اعلیٰ عہدے پر ضلع شیخ پورہ (بہار) میں فائز تھے جہاں شہناز فاطمی کی پیدائش 5رجنوری 1949 کو ہوئی۔وہ امتیاز فاطمی کی سگی بہن ہیں۔ابتدائی تعلیم والد کی نگہبانی میں گھر پر ہوئی۔گورنمنٹ گرلز اسکول پورنیہ سے میٹرک پاس کرنے کے بعد ایم۔اے (سیاسیات) اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں پٹنہ سے حاصل کیں۔شہناز فاطمی موضع کھجواں ضلع سیوان کے باشندے اور طنز و مزاح کے معروف شاعر رضا نقوی واہی کی بہو ہیں۔18 مئی 1976 کو سید جعفر رضا نقوی ابن رضا نقوی واہی سے رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئیں۔

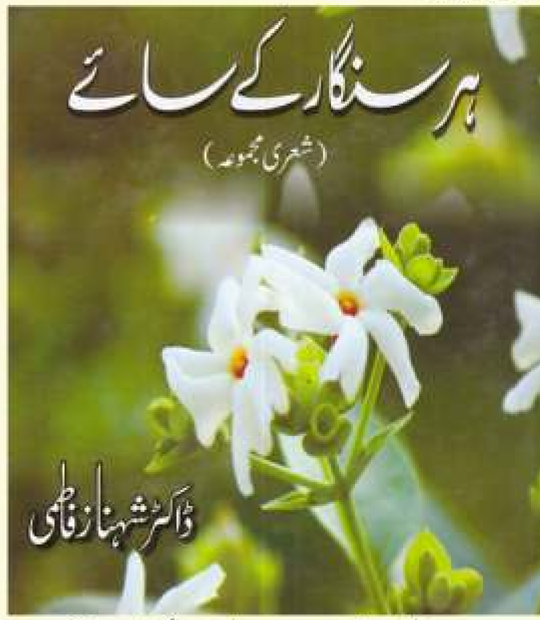

شہناز فاطمی کی تقرری بہار کالج سروس کمیشن سے لکچرر کے عہدے پر ہوگئی۔آپ مختلف کالجوں میں درس و تدریس کی خدمات انجام دینے کے بعد جے۔ڈی مہیلا کالج پٹنہ سے 31 جنوری 2014 کو سبک دوش ہوئیں۔آپ فی الحال پٹنہ میں مقیم ہیں۔آپ کا قلم رواں دواں ہے۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں خوب لکھتی ہیں۔آپ نے اپنی زندگی کے اوقات نہایت منظم اور بہترین سلیقے سے گزارے ہیں۔آپ کی پہلی تخلیق ''ایک اصول ایک فرض'' صبح نو (گیا) کے جولائی 1971 کے شمارے میں شائع ہوئی۔آپ کی تصنیفات درج ذیل ہیں۔

ہندی تصانیف۔:(1) مگر سشما نہیں ٹوٹی (2) لپسا (3) درکتے رشتے (4) لمحوں کی کسک (5) چڑیل (6) چاند

اردو میں مطبوعہ کتابیں (1) درکتے رشتے، 2012 (2) لپسا، 2012 (3) سشما، 2014 (4) لمحوں کی کسک، 2014 (5) چاند کی سحر، 2016 (6) چراغ تہہ داماں، 2016 (7) بولتی آنکھیں، 2017 (8) ہرسنگار کے سائے 2018۔

تراجم (اردو سے ہندی)۔:(1) واہی کی ہاسیہ وینگ رچنائیں، 1993 (2) ترکش واہی، 1995 (3) بیاض بہزاد 1996 (4) کلام شاد 1997 (5) عقائد الشیعہ 1998 ترتیب (1) نقوش بہزاد، 1986 (2) باقیاتِ واہی، 2004 (3) ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم، 2008 (4) شاہکار بہزاد، 2010۔

انگریزی میں مطبوعہ کتاب۔: Directive Principals, An Apprisal. 1996

شہناز فاطمی کالج میگزین کی اڈیٹر رہ چکی ہیں۔آپ کی زیر نگرانی ایک درجن سے زائد طلبا و طالبات نے تحقیقی مقالے لکھے ہیں جن پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔وہ ملک گیر سطح پر منعقد ہونے والے سیمینار میں شامل ہوتی ہیں۔انھوں نے بذاتِ خود متعدد سیمینار کا انعقاد کرایا ہے۔ان کی ادبی خدمات پر ہندی اور اردو دونوں اداروں سے مختلف ایوارڈ مل چکے ہیں۔

ڈاکٹر رضوانہ پروین (پ۔1965):۔ رضوانہ پروین کی پیدائش 8رمارچ 1965 کو پٹنہ میں ہوئی۔ان کی والدہ شہزادی بیگم اور والد محمد علی بہ سلسلۂ ملازمت رانچی میں سکونت پذیر تھے جہاں رضوانہ نے اپنا تعلیمی سفر پورا کیا۔گورنمنٹ ہائی اسکول رانچی سے میٹرک اور مہیلا کالج رانچی سے آئی اے اور بی اے کے امتحانات پاس کیے۔رانچی یونیورسیٹی رانچی سے اردو میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ڈاکٹر رضوانہ پروین کی شادی موضع بھلواں (بڑہریا) ضلع سیوان کے مکیں محمد سراج الحق کے ہمراہ 23راکتوبر 1986 کو ہوئی۔رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد رضوانہ چند ماہ سیوان میں گزار کر جمشید پور منتقل ہو گئیں۔وہاں ان کے شوہر ٹیسکو اسٹیل کمپنی میں اعلیٰ افسر ہیں۔راقم الحروف کا آبائی وطن بھی وہی گاؤں ہے اس لیے محمد سراج الحق سے گھریلو تعلقات ہیں۔رضوانہ پروین کے لیے جمشید پور کی آب و ہوا اور ادبی فضا ساز گار ثابت ہوئی۔ان کی پہلی ملازمت سینٹرل کریمیہ ہائی اسکول میں استاد اردو کے عہدے پر ہوئی۔وہاں تقریباً آٹھ برسوں تک اپنی خدمات انجام دیں۔اس کے بعد ان کی تقرری جمشید پور ویمنس کالج، بسٹو پور میں بہ

حیثیت اسسٹنٹ پروفیسر اردو ہوگئی۔ فی الوقت اسی کالج میں صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز ہیں۔

رضوانہ پروین بنیادی طور پر شاعرہ ہیں اور اپنا تخلص ارم لکھتی ہیں۔ لیکن نثر نگاری سے بھی ان کا گہرا شغف ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ 'بساط آرزو' شائع ہو چکا ہے۔ ان کا شاعرانہ خیال اور تخلیقی فکر نسائی آواز سے عبارت ہے۔ ڈاکٹر ارم کی شاعری میں عورت ہونے کے دکھ، مردوں کی بے اعتنائی، رشتوں کی ناہمواری اور شخصیت کی ناقدری جیسے موضوعات پر بڑے ہی بولڈ اور بے باکانہ انداز کے اشعار نظر آتے ہیں۔

کب تک ڈر ڈر کے جیتی
کب تک اشکوں کو پیتی
کب تک اپنے زخموں کو
اپنے لہو کا رنگ دیتی

طلب نہیں کے مرے خار کو گلاب کرو
جو ہو سکے تو مرے غم کا احتساب کرو

وہ کون سا دکھ ہے جو اس نے نہیں دیا
خوشیوں کو مری ذات میں بسنے نہیں دیا

ان کی غزلوں کا رنگ ملاحظہ کریں۔

ترا خیال چمکتا ہوا ستارہ سا
ترا وجود محبت کا استعارہ سا

رضوانہ پروین فعال شخصیت ہیں۔ موصوفہ نصف درجن سے زائد تنظیموں اور اداروں سے براہِ راست وابستہ ہیں۔ نثر نگاری میں بھی ان کے کارنامے لائق اعتنا اور قابل تعریف ہیں۔ ان کی ایک تنقیدی تخلیق "فیض احمد فیض کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ" شائع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب ان کی پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے۔ ان کے مختصر افسانوں کا مجموعہ گونج دیوناگری رسم الخط میں منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''بہار شرر بار'' 2018 میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں کل اکتیس افسانے، دو تنقیدی مضامین اور چند مشاہیر ادب کی آرا شامل ہیں۔ رضوانہ پروین کے دو شعری مجموعے اور تنقیدی کتاب بنام 'اردو ادب کی مزاحمتی آواز' (مائنر ریسرچ پروجیکٹ) زیرِ اشاعت ہیں۔

رضوانہ پروین آل انڈیا ریڈیو جمشید پور اور رانچی سے بھی منسلک ہیں۔ وہاں سے نشر ہونے والے ادبی مباحثوں اور مذاکروں میں حصہ لیتی ہیں اور ریڈیو سے نشر ہونے والے خواتین کے ہر دل عزیز پروگرام 'انگنا' اور 'کہکشاں' میں باقاعدگی سے شرکت کرتی ہیں۔ ان کی ادبی و شعری خدمات کے اعتراف میں متعدد اداروں نے انعامات دیے ہیں۔ ابھی موصوفہ کا ادبی سفر جاری ہے اور ان کی ادبی قدر و قیمت کا تعین ابھی باقی ہے۔

ڈاکٹر تنظیم الفردوس (پ۔ 1966): ۔ پروفیسر ڈاکٹر تنظیم الفردوس جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو کی صدر نشین اور اردو زبان و ادب کی استاد ہونے کے علاوہ علمی و ادبی حلقوں میں ایک سنجیدہ محقق کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ آپ کی پیدائش 28 رمئی 1966 کو چاٹگام (مشرقی پاکستان) میں ہوئی آپ کے والد سید محمد توحید کا تعلق کوتھ ضلع بلیا (یوپی)

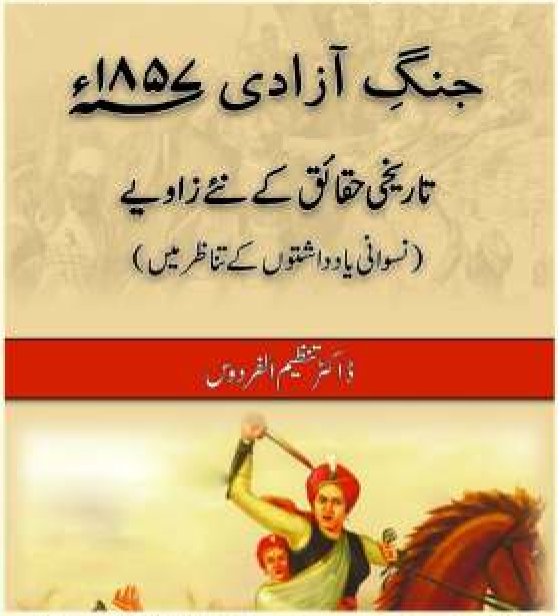

سے تھا، لیکن آپ کے دادا سید عبدالقدیر نے حصول علم کی غرض سے گورکھپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ سید محمد توحید اپنے والدین کے پانچ بیٹوں اور دو بیٹیوں میں پانچویں نمبر پر تھے۔ ان کی شادی والدہ ام حبیبہ کی تجویز پر ماہ پور ضلع سیوان (بہار) کی ایک معزز شخصیت عبد المجید رشیدی کی صاحبزادی رضیہ خاتون سے ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد سید محمد توحید مشرقی پاکستان کے چاٹگام چلے گئے اور وہاں محکمۂ ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ تنظیم الفردوس اپنے والدین کی ساتویں اولاد اور پہلی بیٹی ہیں۔ اس لیے خاندان کے لیے غیر معمولی خوشی کا سبب بنیں۔ تنظیم کی ماں نے اپنی بیٹی کی تعلیم کے لیے گھر پر ہی مناسب انتظام کیا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد یہ خاندان کراچی چلا گیا۔ وہاں جامعہ کراچی سے تنظیم الفردوس نے امتیازی نمبروں کے ساتھ ایم۔ اے کیا۔ وہ ''اردو لغت بورڈ'' سے بطور اسکالر وابستہ ہوئیں اور بعد میں درس و تدریس کا شعبہ ان کا مقدر بنا۔ کراچی کے ایک نمایاں تعلیمی ادارے میں لکچرر مقرر ہوئیں اور بعد ازاں جامعہ کراچی کے

شعبۂ اردو سے وابستہ ہوگئیں۔ 'اردو کی نعتیہ شاعری میں مولانا احمد رضا خاں کی انفرادیت واہمیت' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر جامعہ کراچی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ فی الحال اسی کالج میں پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کے عہدے پر فائز ہیں۔

تنظیم الفردوس کی طبع شدہ کتابیں حسب ذیل ہیں۔ (1) مولانا احمد رضا خاں کی نعت گوئی: انفرادیت واہمیت (2) ممتاز شیریں۔ فن و شخصیت (3) جنگ آزادی 1857۔ نسائی یاداشتوں کے تناظر میں (4) انتخاب کلام بہادر شاہ ظفر (5) انتخاب کلام شبلی نعمانی (6) انتخاب کلام رضا علی وحشت کلکتوی (7) بدلتا منظر نامہ

زیر طبع تصانیف۔ (1) انتخاب کلام شکیب جلالی (2) خطوط غالب (3) مضامین سر سید (1) ممتاز شیریں کے مترجمہ افسانے۔ (مشرق ومغرب کی کہانیاں)

تنظیم الفردوس کی شادی الہ آباد (یوپی) کے پرگنہ چائل سے تعلق رکھنے والے شمس الدین ابن سید اسرار احمد بخاری سے ہوئی۔ وہ ماہر جرمیات ڈاکٹر ہیں۔ والدین کے زیر سایہ تنظیم کے جس شعری ذوق کی تربیت ہوئی وہ جامعہ کراچی میں پروان چڑھی۔ وہاں باقاعدہ شعر کہنے لگیں۔ ہندی آمیز لفظیات ان کی نظموں اور غزلوں میں شامل ہوکر آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ بدلتا منظر نامہ ان کا شعری مجموعہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

درد دے کہ درماں دے، یہ خوشی تو اس کی ہے
ہم نے بس گزاری ہے ، زندگی تو اس کی ہے
کھلتی چاندراتوں میں دل نے ہم کو سمجھایا
دور تک ستاروں میں روشنی تو اس کی ہے

دھوپ میں برسات کا منظر بدلنا چاہیے
اب ہماری ذات کا منظر بدلنا چاہیے

خورشید جبیں چاندنی (پ۔1964):- خورشید جبیں چاندنی کا آبائی وطن موضع مادھوپور ضلع سیوان ہے۔ ان کے والد کا نام حافظ شمس الضحیٰ (مرحوم) ہے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں ہوئی جہاں والد محترم معلم کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا اور وہاں کے حکیم اجمل خاں طبیہ کالج سے بی یو ایم ایس کی ڈگری حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ادب وثقافت کے فروغ میں طلبا کے ساتھ ساتھ طالبات کا بھی اہم رول رہا ہے۔ خورشید جبیں چاندنی جب علی گڑھ میں زیر تعلیم تھیں تو نیو ہال برائے طالبات کا پہلا اردو مجلّہ 'النساء' کی اشاعت میں کلیدی کردار نبھایا تھا۔ وہ اس رسالے کی اڈیٹر تھیں۔ اس وقت جناب محمد حامد انصاری یونیورسٹی کے وی سی تھے۔ انھوں نے خورشید جبیں کو نیک خواہشات سے نوازا تھا۔ ان کے افسانوں اور انشائیوں کا مجموعہ 'تعاقب' شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے اپنے سماج اور معاشرے کے گرد وپیش کو اپنے افسانوں کا مرکز بنایا ہے۔ ان کا تخلیقی شعور پختہ ہے۔ ان کے جذبات واحساسات پاکیزہ اور صالح ہیں۔ امید ہے کہ آنے والے دنوں میں اور اچھی تخلیقات سے قارئین محظوظ ہوں گے۔

مذکورہ بالا خواتین قلمکاروں کے علاوہ محترمہ رضیہ سلطانہ، رخسانہ مراد، جگنو، سعدیہ پروین، عفیفہ پروین اور مریم فاطمہ وغیرہ کے مضامین اردو کے مقتدر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مریم فاطمہ کی مرتب کردہ کتاب 'تکمخیاں' چند دنوں قبل طبع ہوکر منظر عام پر آئی ہے۔ یہ بزرگ اور کہنہ مشق ادیب جناب شبر امام کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ رخسانہ مراد کی پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ بعنوان 'اردو میں شخصی مرثیوں کا تنقیدی جائزہ' شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے بعد کوئی قابل ذکر کارنامہ منظر عام پر نہیں آیا۔ رضیہ سلطانہ نے لوک گیتوں کا مجموعہ مرتب کیا ہے لیکن اس کی طباعت ابھی نہیں ہوئی ہے۔

کتابیات:

1-سیدہ اور ان کی تاریخ گوئی۔ ڈاکٹر محمد مظاہر الحق، نعمت اللہ ایجوکیشنل سوسائٹی، پٹنہ، 1997

2-تعاقب۔ خورشید جبیں چاندنی۔ انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس، علی گڈھ، یوپی 2001

3-ماہنامہ شاعر (ممبئی) افتخار امام صدیقی۔ جون 2006

4-ایک قطرہ آنسو۔ امتیاز فاطمی 2006

5-سہ ماہی مژگاں، بہار کا معاصر اردو ادب، جلد دوم۔ نوشاد مومن۔ 21، علیم الدین اسٹریٹ کولکاتہ، 2017

6-بولتی آنکھیں۔ ڈاکٹر شہناز فاطمی۔ ارم پبلشنگ ہاؤس، پٹنہ 2017

7-یادوں کے چراغ۔ مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی۔ ارم پبلشنگ ہاؤس پٹنہ 2017

□□□

Dr.Irshad Ahmad

House No. 1731

"Amina Manzil"

Islamia Nagar,Siwan- 841226 (Bihar)

اردو کی غزلیہ شاعری میں طنزیاتی و مضحکاتی عنصر

ڈاکٹر روشن آرا

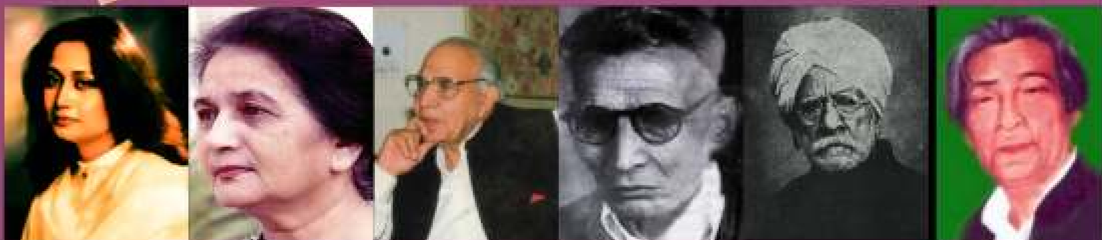

غزل اردو کی نہایت ہر دلعزیز اور مقبول صنف ہے اور اسے بجا طور پر سرتاج السخن بھی کہتے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ تنگ نظروں نے اس پر اعتراضات کی بوچھاریں بھی کیں لیکن اس نے تمام وار خود پر سہے اور پھر ثابت قدمی کے ساتھ پھر سے مستحکم ہوگئی۔ البتہ ان اعتراضات کے بعد اس کی تنگ دامانی کا جو رونا رویا جاتا تھا، اس میں کافی وسعت پیدا ہوئی اور ذات سے لے کر کائنات تک اور ذرے سے آفتاب تک ہر ایک موضوع کو غزل کی روح میں پیوست کرنے کا رجحان عام ہوا۔ غزل کا سانچہ اور اس کی ہیئت اس طرح ترتیب دی گئی ہے کہ غزل کسی طور بھی اس میں ذرا سی تبدیلی کو گوارہ نہیں کر سکتی اور نہ وہ اس کی متحمل ہو سکتی ہے کہ کسی طرح کی آزادہ روی کو برداشت کر سکے، جس کا نتیجہ آزاد غزل کی ناکامی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کے باوجود موضوعی اعتبار سے اس نے ہر دور میں اپنی جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ کلاسکی شعراء کی غزلوں کا مطالعہ کریں تو ان میں جاگیردارانہ سماج پوری طرح اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ حالانکہ اس ضمن میں دہلوی اور لکھنوی غزل گوئی میں ایک طرح کے بُعد کا احساس ہوتا ہے، جہاں ایک طرف داخلیت، طرفگی، دل نشینی، جاذبیت، دلی کیفیات، مایوسی و محرومی کی فراوانی ہے تو دوسری طرف خارجیت، کیف و آگیں، طرح داری، رندی و سرمستی عیاں ہیں۔ حالانکہ اس دور میں چند شعرا نے فلسفہ و تصوف کو غزل میں شامل کیا، لیکن لکھنوی شعراء کی بوالہوسی نے غزل کے مزاج کو کافی متاثر کیا، جس کے سبب پوری غزلیہ شاعری کی گردن زدنی کا مطالبہ کیا جانے لگا

لیکن اس ضمن میں مرزا غالب کی اجتہادی جہتوں کو نہیں بھولنا چاہیے، جنھوں نے جاگیردارانہ سماج و معاشرے میں رہنے کے باوجود بھی اپنی غزلوں میں فکری عناصر کو شامل کر کے بڑا اہم کارنامہ انجام دیا ہے اور غزل میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ تخیل، رمزیت، ایمائیت، تہذیبی رکھ رکھاؤ، فلسفہ و حکمت، معاملاتِ عشق و روزگار کے بیان کے ساتھ سماج و معاشرے کی بے راہ روی پر طنز بھی کلاسکی غزل کی روایت میں مل جاتا ہے۔ تاہم اس دور کی غزلوں میں طنز و مزاح کو شامل کرنے والوں میں چند شعراء ہی ملیں گے جن میں سودا اور غالب سرِ فہرست ہیں۔ میر حالانکہ سرتاج الشعراء کے مسند پر فائز ہیں لیکن ان کا بیشتر کلام داخلی معاملات پر محصور ہے اور انھوں نے کائنات کو بھی ذات کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان کے یہاں جو ذاتی لمس ہے اس میں ہر کسی کو اپنے دل کی آواز صاف سنائی دیتی ہے لیکن اس کے باوجود میر نے زمانے کی نوحہ خوانی اپنی غزلوں میں کم ہی کی ہے۔ جبکہ سودا کی غزلوں میں معاشرے کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ سودا کے متعلق یوں تو کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ آسودہ حال رہے، اس لیے ان کی شاعری میں نشاطیہ آہنگ رچا بسا ہے۔ اس کے باوجود جب ہم ان کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ان میں زمانے کا درد و کرب صاف جھلکتا ہے اور اس کے باوصف ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ سودا نے ذات سے لے کر معاشرے تک غزل کا دائرہ وسیع تر کر دیا ہے اور اسے وسیع تر مفہوم میں زمانے کے سامنے رکھا ہے۔ سودا بھی اپنے ہمعصروں کی طرح زمانے کے

نشیب وفراز کے گواہ رہے لیکن انھوں نے اپنے یہاں یاسیت اور قنوطیت کو پھٹکنے بھی نہیں دیا بلکہ پوری رجائیت اور بانکپن کے ساتھ زمانے کے حالات کو غزل کی روح میں پیوست کرتے رہے۔ سودا کے اس وصفِ خاص کے متعلق میر سے موازنہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسن یہ کہنے میں حق بجانب ہیں:

"سودا نے غزل کا دائرہ ذات سے معاشرے تک وسیع کر دیا۔ میر کائناتی اور آفاقی مسائل کو بھی ذات کے حوالے سے اور نجی اور ذاتی بنا کر بیان کرتے ہیں۔ سودا ذات کو بھی آفاق اور کائنات کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک پوری زندگی ایک شخصیت ہے اور اس کا ہر رنگ اور ہر احساس مختلف کیفیات اور تجربات سے عبارت ہے۔ یہ گویا پوری زندگی ایک تہذیبی شخصیت کی زندگی ہے جسے دور یا معاشرے کا نام دیا جا سکتا ہے اور یہ جہاں بینی اور عالم آشنائی سودا کی غزل کا نیا آہنگ ہے"۔

(سودا کی غزل گوئی، پروفیسر محمد حسن، مشمولہ: اردو غزل۔ مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی۔ ص100۔2006۔اردو اکیڈمی، دہلی)

جہاں بینی و معاشرہ شناسی میں غالب سب پر سبقت لے گئے۔ انھیں حالی نے حیوانِ ظریف کہا ہے لیکن ان کی شوخی و ظرافت اور قہقہے کے پیچھے ایک طرح کا کرب جھلکتا ہے جو کہ ان کی پوری زندگی پر محیط ہے اور جس کے سبب نشاطیہ آہنگ کے ساتھ ایک طرح کی آہ بھی ان کی شاعری میں سنائی پڑتی ہے، جس کا اظہار انھوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ لب آشنائے خندہ ہے

تاہم طنز و مزاح کے باب میں غالب کے کارہائے نمایاں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب سے قبل غزل کا یہ آہنگ تقریباً ناپید تھا۔ انھوں نے ذات اور کائنات دونوں کے مسائل کا احاطہ اپنی شاعری میں بخوبی کیا ہے۔ اپنی پوری زندگی کے درد و الم کے باوجود چند اشعار میں اس فضا کو مسلط ہونے نہیں دیا اور دل کو خوش کرنے کا سامان بہم پہنچاتے رہے تاہم ان کے وہ اشعار ہی زیادہ پر اثر ہیں جن میں نشاط کے ساتھ درد کی لہر بھی شیر و شکر ہوگئے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اکبر الہٰ آبادی طنزیہ و مزاحیہ غزل گوئی کے سب سے بڑے علمبردار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں جذبے کا بہاؤ تیز تر ہے۔ انھوں نے غزل کی نرگسیت کے دائرے میں سماجی و سیاسی اور معاشرتی مسائل کو سمو کر غزل کی ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ جہاں انھوں نے مغربی تہذیب کی عشوہ طرازیوں پر طنز کا زور صرف کیا وہیں دوسری طرف اپنی قومی بے راہ رویوں کو بے نقاب بھی کیا ہے۔ وہ مغربی تہذیب و تعلیم اور طرزِ معاشرت کو مسلمانوں کے حق میں سمِ قاتل تصور کرتے تھے اور سرسید احمد خان، چونکہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے اسی راستے کو بہتر جانتے تھے، چنانچہ اکبر نے اپنے طنز کا رخ سرسید کی طرف موڑ دیا اور اس تحریک کے ہر پہلوؤں کو طنز و تحقیر کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اس ضمن میں سرسید کا منشا و مقصد کیا تھا؟ اس کی گواہ ہر نظر ہے تاہم سرسید کی مخالفت میں اکبر پر رجعت پسندانہ الزام در آیا۔ حالانکہ آخر آخر وقت میں اکبر نے سرسید تحریک کا اعتراف بھی کیا لیکن مستقبل کی پیشین گوئی بھی کر دی۔ سرسید سے انحراف کے باوجود انھوں نے چند مذہبی صداقتوں پر بھی انگشت نمائی کی ہے، جن سے واضح ہوتا ہے کہ سماج و معاشرے کی ہر خرابی پر ان کی نظر گہری تھی۔

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر غزل کی پوری شدت کے ساتھ مخالفت کی گئی۔ اس کی ریزہ خیالی اور عدم تسلسل پر اعتراضات کیے گئے اور اس کی جگہ نظم کو وسیلۂ اظہار کے طور پر اپنایا گیا لیکن اپنی اس کوشش میں وہ یہ بھول گئے کہ غزل کی ریزہ خیالی ہی دراصل اس کا حسن ہے۔ دو مصرعوں میں پوری بات کہہ دینے کا فن غزل کے علاوہ کسی دوسری صنف کو حاصل نہیں۔ غزل کی اسی خصوصیت کا اظہار جاں نثار اختر نے اپنے اس شعر میں بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

غزل کی شگفتگی، شیرنی اور گھلاوٹ کو دیکھتے ہوئے ترقی پسند شعرا نے اپنی کرخت اور تیکھے انداز کی ترسیل کے لیے اسے ناکافی سمجھا لیکن وہ یہ سمجھ نہ سکے کہ ان اوصاف کے علاوہ غزل میں مضمون آفرینی، ندرتِ خیال، جوشِ بیان اور سوز و گداز بھی ہے، جن کے سبب غزل ہر طرح کے موضوعات کو پیش کرنے کی سکت رکھتی ہے۔ غزل نے ہر دور کے تقاضوں کو بڑی خوبی کے ساتھ پورا کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی مخالفت کے بعد غزل تھوڑے عرصے کے لیے دب سی گئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی۔ اس کے اندر دبی ہوئی چنگاریوں نے آزادی کے بعد ہی ایسا چولا بدلا کہ غزل زمانے کا ساتھ دینے کے قابل ہوگئی اور اس میں پائی جانے والی جاگیردرانہ رجعت پسندی کا تقریباً خاتمہ ہوگیا۔ نئے نئے موضوعات نئے تقاضے لیے ہوئے غزل میں داخل ہونے لگے۔ حالانکہ ترقی پسند تحریک کی غزل مخالف رویے

کے باوجود بھی چند ترقی پسند شعرانے غزل کے زلف کی مشاطگی کا فریضہ بھی انجام دیا ہے اور اسے نئی معنویت بخشی ہے۔ ان شعرا میں فیض سب سے منفرد ہیں انھوں نے غزل کے نرم، ملائم اور سبک لہجے میں اپنے ترقی پسندانہ خیالات کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دو اشعار دیکھئے، جن میں طنز کی لطافت اپنے عروج پر ہے ۔

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیانِ چمن
کھلے نہ پھول اسے انتظام کہتے ہیں

آزادی کے بعد طنزیہ و مزاحیہ غزل گوئی میں جن شعرانے نمایاں نام پیدا کیا ان میں سید ضمیر جعفری، مجید لاہوری، جوش ملسیانی، احمق پھپھوندوی، شاد عارفی، شوکت تھانوی، ناظم انصاری، ماچس لکھنوی، ظریف جبلپوری، مرزا کھونچ، شوق بہرائچی وغیرہ اہم ہیں۔ حالانکہ اس فہرست میں بہت سے نام شامل کیے جا سکتے ہیں لیکن ان شعرا کی غزلوں میں پستی اور سطحی پن نمایاں ہے۔ متذکرہ بالا شعرانے غزل کی چاشنی کے ساتھ طنز اور مزاح کا امتزاج پیدا کیا اور غزل میں مزاح کی آمیزش سے ایک خوشگوار اور پر کیف فضا کی بھی تعمیر کی۔ ان میں چند شعراء ایسے بھی ہوئے جو طنز کی مخصوص روش پر ہی گامزن رہے اور اپنی غزلوں میں مزاح کے داخلے کے لیے چھوٹی سی کھڑکی ہی کھلی رکھی۔ ایسے شعراء میں شاد عارفی سب سے اہم ہیں۔ ان کی غزلیں سنجیدہ طنز کی شاہکار کہی جا سکتی ہیں۔ ان کی غزلوں سے سماج و معاشرے کے کئی مسائل آشکار ہوئے ہیں۔ لہٰذا یونس فہمی کے مطابق:

> ''خوبصورت لفظوں میں لطافت و نزاکت کے ساتھ معاشرتی خامیوں پر طنز کرتے ہیں۔ مزاح کو زیب داستان کے لیے استعمال کرتے ہیں''

(آزادی کے بعد اردو شاعری میں طنز و مزاح۔ یونس فہمی۔ ص 162۔ 2012۔ ایم آر پبلی کیشنز۔ دہلی)

ان کے یہاں مزاح تو زیب داستان ہو سکتا ہے لیکن طنز اس پوری داستان پر حاوی ہے۔ سماج و معاشرے کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جو ان کی پہنچ سے آزاد ہو۔ تاہم سیاسی موضوعات پر کہی گئی ان کی غزلیں بھرپور طنزیہ وار کرتی ہیں۔ چند اشعار پر غور فرمائیے ۔

تمھیں رہبر سمجھنا پڑ گیا ہے
ہماری بے کسی کی انتہا ہے
زک پہنچانے کی تاک میں ہیں ہم دونوں لیکن کہنے کو
وہ مجھ کو پڑوسی کہتے ہیں میں ان کو پڑوسی کہتا ہوں

طنزیہ و مزاحیہ غزل گوئی میں سید ضمیر جعفری نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ان کے یہاں غزل اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ طنز و مزاح کا ساتھ دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ غزل کی رمزیت اور تہہ داری کا فائدہ ضمیر جعفری نے خوب اٹھایا ہے۔ بسا اوقات تشبیہات و استعارات کو شعری پیکر میں ڈھال کر طنز و مزاح کے پھول کھلائے ہیں۔ ان کے کلام میں شگفتگی اور شائستگی کا عمدہ امتزاج نظر آتا ہے۔ پھکڑ پن اور سطحیت سے انھوں نے اپنا دامن بچائے رکھا اور روزمرہ کے موضوعات کو اپنی غزلوں میں یکجا کر دیا۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں ۔

کس کی حاجت روا کرے کوئی
کس قدر بے شمار ہیں ہم لوگ

ظریف جبلپوری بھی طنز و مزاح کے کارواں میں سرگرم سفر رہیں۔ ان کی غزلوں میں روایتی انداز مضمر ہے اور زیادہ تر شیخ و برہمن اور عشق و عاشقی کے پردے میں مزاح کاری کی ہے لیکن جب وہ ریا کار عبادت کرنے والوں پر طنز کے تیر برساتے ہیں تو ان کا وار کارگر جاتا ہے ۔

جھکانے کو ہر در پہ سر جھکا دوں
نمائش کا سجدہ عبادت نہیں ہے

چند اشعار دیکھیے ۔

بس تم شب فراق میں ناول پڑھا کرو
عاشق کو چارہ ساز یہ نسخہ بتا گیا
خاکِ درِ جاناں کا سرمہ جو نہیں ملتا
بیمار محبت کو دھندلا نظر آتا ہے

شوکت تھانوی نے نثر و شاعری دونوں میں طبع آزمائی کی ہے اور مزاح کے نت نئے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ شوکت تھانوی کا مزاحیہ شعری مجموعہ بھی دستیاب ہے اور کچھ بکھرے ہوئے اشعار ان کے مختلف ناولوں میں بھی مل جاتے ہیں جن سے ان کے ذوق مزاح کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں طنز کا کافی حد تک فقدان ہے البتہ مزاح نگاری کمال کی ہے۔ وہیں دوسری طرف مجید لاہوری نے غزل کے کلاسکی اسلوب کو اپنے فن میں سمویا ہے۔ ان کے یہاں روایت کا احترام اور قدروں کا لحاظ ہے تاہم ہنگامی موضوعات کو بھی بقدر شوق اپنی غزلوں کا حصہ بنایا ہے جن سے ان کے یہاں طنز و مزاح کی صورت گری ہوئی ہے۔ وہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی موضوعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی غزلوں میں پیوست کرتے ہیں۔ زمانے کی بگڑتی صورت کا نقشہ مجید کی اس غزل کے چند اشعار میں دیکھیے:

بس اک شئے موت ہے جو خیر سے ملتی ہے بے راشن
وگرنہ ساری چیزوں کی گرانی ہے جہاں میں ہوں
ابھی تک پگڑیوں میں ہے شکوہ تاج سلطانی
ابھی تک رشتوں کی حکمرانی ہے جہاں میں ہوں

احمق پھپھوندوی کی غزلوں میں بھی طنز و مزاح کی سلیقہ مندی جھلکتی ہے۔ اصلاحی و اخلاقی نقطۂ نظر سے انھوں نے سماج و سیاست اور معاشرے کے کئی معترضہ پہلوؤں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کا سماجی و معاشرتی شعور پختہ ہے، جس کے سبب ہر کجروی کی گرفت بڑی آسانی سے کر لیتے ہیں اور پھر اپنے خیالات و فرمودات کو غزل کی لطافت میں سمو کر دو آتشہ بنا دیتے ہیں۔ انداز ملاحظہ فرمائیں۔

طے کر چکے منازلِ تہذیب و ارتقا کے
ڈالیں اب اہلِ یورپ دنیا میں خوب ڈاکے
پہنچی جاں کنی اینٹھے جو خان بہادر
بولی اجل اکڑنا اب تم لحد میں جاکے

اس کارواں میں ماچس لکھنوی بھی شامل ہیں ان کے یہاں روایت کی پاسداری کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کی تنگی کا احساس گراں گزرتا ہے۔ بیشتر شیخ و برہمن پر وار اور گھریلو معاملات پر ہی اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ تاہم مزاحیہ عناصر کی فراوانی نے ان کے فن کو جلا بخشی ہے۔ دوسری طرف ناظم انصاری کی غزلوں کا مجموعہ ''گوبھی کے پھول'' کے عنوان سے منظرِ عام پر دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ ان کے یہاں بھی عشقیہ معاملات ہی جگہ بنا پاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں طنز و مزاح کی سماجی و سیاسی اور معاشرتی کیفیات کا اندازہ لگانا ذرا مشکل امر ہے، تاہم عشقیہ معاملات میں مزاح کو اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ چند شعرا کے کلام سے نمونے پیش کرتی ہوں تاکہ اردو غزل میں موجود طنزیہ و مزاحیہ عناصر کی موجودگی کا پتہ لگایا جا سکے۔

بنگلہ ہی نہیں گور بھی انساں کے لیے ہے
یہ ٹیا محل بھی اسی مہماں کے لیے ہے
(جوش ملسیانی)

یہ عفوِ نا مناسب نہیں تیرے اے دوست
بلینک ورس میں قدرت نے شاعری کی ہے
(شوق بہرائچی)

جنگ چھڑی ہے کھاری میں
تیل ندارد گاڑی میں
سوپر پاور الجھا ہے
ریگستانی جھاڑی میں
(مرزا کھونچ)

ہو نہ جائے وہی جس بات سے ڈر لگتا ہے
ضبطِ تولید کی سوغات سے ڈر لگتا ہے
(عبدالصمد جاوید)

درج بالا شعرا کے کلام کے اس جائزے سے بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان شعرائے طنز و مزاح نے غزل کے پیرائے میں عصری مسائل کو کتنی فن کاری کے ساتھ سمویا ہے اور پھر ان کے یہاں موضوعات کی وسعت کے ساتھ فن کی تابندگی بھی موجزن ہے۔ انھوں نے غزل کے حسن کو مجروح کیے بغیر طنز و مزاح نگاری کی ہے۔ ان کی غزلوں میں تڑپ ہے، چبھن ہے، کاٹ ہے، شوخی ہے، بے باکی ہے۔ اس کے باوجود غزلیہ شائستگی اور برجستگی بھی اپنا حسن رکھتی ہیں، جن سے ان شعراء کی غزلوں کی شناخت ہوتی ہے۔

خالص مزاحیہ غزل گوئی کے ضمن میں چند شعراء نے کافی شوخیاں کیں ہیں اور غزل میں ایک مزاحیہ رو کو بھی شامل کر کے ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ ہکلی غزل کے عنوان سے چند شعراء کی غزلیں ملتی ہیں، جن میں ہکلے انداز میں غزل کہہ کر مزاح نگاری کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔ ایسے شعراء میں دلاور فگار اور سید محمد جعفری نمایاں ہیں۔ سید محمد جعفری طنز و مزاح کے معتبر شعرا میں شمار ہوتے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے اپنی توجہ نظم ہی کی طرف موڑے رکھی لیکن پھر اپنے شعری کمالات کو دکھانے کے لیے غزل کے میدان میں بھی کود پڑے اور ہکلی غزل لکھ کر اجتہاد پسندی کا ثبوت دیا لیکن ہکلی غزل لکھنے میں دلاور فگار زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ فگار چونکہ خالص مزاح کے شاعر ہیں، اس لیے ان کی غزلوں میں ایک نشاط پرور فضا کی حکمرانی ہے تاہم نمونے کے طور پر دونوں شعرا کی غزلوں سے نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

رر ریڈیو سے ج جنگ کی خ خبریں سن کے مگن نہ ہو
ص صغیر طائر خوش نوا، ن نفیر زاغ و زغن نہ ہو
ن ن نامہ پرششش و پنج میں م م مجھ سے پ پ پوچھتا
ک کمر تو ان کے وہ ہے نہیں ک ک کیا کروں جو دہن نہ ہو
ش ش شہ کو کیا کہوں س سمجھ لیں آپ ب بس یہی
م م مقبروں کا ہو پاسباں ک کسی لحد میں کفن نہ ہو
(سید محمد جعفری)

تیری ذات سے مجا جانِ من، مما مجھ کو ہی پپا پیار ہے
غفا غیر ہے نخا خود غرض، ووا وقت کا پیا یار ہے
پچا چادریں میں چڑھاؤں گا سسا سدو کی قفا قبر پر
حا حضرت، قفا قیس کا بھبھا بھوت مجھ پہ سوار ہے
بیا بیاہ تجھ سے کروں گا میں تتا تیرے ساتھ مروں گا میں
ککا کینسر ہے مجھے اگر دودق کی تو بھی شکار ہے
نخا خط میں تو نے یہ کیا لکھا ووا وصل غیر سے ہوگیا
نخا خط ترا نخا خط نہیں، میری موت کا تار ہے

(دلاور فگار)

غزلوں میں انگریزی الفاظ کے برجستہ اور پر کیف استعمال سے بھی ہمارے مزاح نگاروں نے مزاح کی نادرہ کاری کی ہے۔ چند مثال دیکھتے چلیں ؎

وہ بے وفا تھے راہ کی Turning میں رہ گئے
ہم تو اکیلے لائف کی Burning میں رہ گئے
شادی کے بعد وہ کئی بچوں کی ہیں Mother
غافل تھے ہم جو عشق کی Learning میں رہ گئے
سب کی Train عشق کی منزل پہ جا لگی
ہم انتظارِ یار کی Shunting میں رہ گئے

(مصطفیٰ کمال)

غزل میں یہ گل افشانیاں تو خیر ہمارے خالص طنز و مزاح نگاروں نے کی ہے لیکن غزل کی روح میں طنز کی کسک کا زیادہ احساس سنجیدہ شعراء کی غزلوں میں ہوتا ہے۔ ان کے یہاں مزاح تو خیر تقریباً ناپید ہے لیکن طنز کو انھوں نے اپنے اسلوب میں شامل کر کے پرتاثیر بنایا ہے اور اسے نئے روپ میں سامنے لائے ہیں۔ غزل کے بارے میں یہ رویہ عام تھا کہ اس میں محض سبک، شستہ، شیریں اور نادر خیالات ہی جگہ پاسکتے ہیں لیکن موجودہ عہد کے شعراء نے غزل میں طنزیہ آہنگ کے ذریعہ روحِ عصر کو بھی شامل کرلیا ہے اور آزادی کے بعد سے لے کر اب تک مختلف مسائل سے لڑ رہے سماج و معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ ان کے یہاں ایک طرح کی تلخی، جذبے کی شدت، لہجے کی کاٹ، درد و کرب، چبھن، گھٹن وغیرہ کا احساس ہوتا ہے۔ حالانکہ جدیدیت کے زیرِ اثر اجتماعیت کے بجائے فردیت پر زور دیا گیا لیکن یہاں بھی فرد کے مسائل اپنے پورے سیاق وسباق کے ساتھ اجاگر ہوئے۔ مزید برآں جدیدیت کے زور کے تھمتے ہی مابعد جدیدیت اور پھر موجودہ عہد کی شعری حسیت کی طرف غزل نے قدم بڑھایا تو اس نے خود کو عصری بصیرت کا بھرپور حصہ بنایا۔ شعراء نے سماج کی ہر کمزوری کی گرفت کی، ہر ظلم و زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کیا۔ اپنے اظہار کی ترسیل کے لیے وہ ہر طرح کے شعری لوازمات کو بروئے کار لائے۔ کہیں وہ تلمیح کے ذریعہ ماضی و حال کا موازنہ کرتے ہیں تو کہیں تشبیہ و استعارے کا سہارا لے کر شعر کو معنویت عطا کرتے ہیں تو کہیں ذو معنی انداز اختیار کر کے اشعار کو دو آتشہ بنانے کا ہنر دکھاتے ہیں۔ غرض ان کے یہاں فنی رچاؤ بھی ہے اور اسی فن کے اندرون میں انھوں نے طنز و مزاح کو فروغ بھی دیا ہے۔ نئی غزل کے اس طنزیاتی پہلو کی طرف صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے مضمون ''غزل اور نئے تقاضے'' میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

''طنز کا پہلو بھی آج پہلے سے زیادہ ہے، زمانے کے چلن اور تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی ہوا کے آگے کھڑا نہ رہ سکنا، ایسا تجربہ ہے جو کسی کو اداس کرتا ہے اور کسی کو خود اپنے آپ پر ہنسنے پر مائل کرتا ہے''

(فکر و تحقیق۔ نئی غزل نمبر۔ ص 11۔ جنوری تا مارچ 2013۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ دہلی)

غزل کا نیا رنگ کیسا ہونے والا ہے اس کا اندازہ صدف جعفری کے اس شعر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے ؎

نہیں اب ساغر و صہبا کا موسم
غزل تیغوں پہ ہم کہنے لگے ہیں

یہی سبب ہے کہ نئی غزل میں نئی فضا اپنی بھرپور معنویت کے ساتھ چھائی ہوئی ہے۔ چند موضوعات کے سہارے ہم اسے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ غزل کی روایت میں واعظ و محتسب، شیخ و برہمن پر واضح طنز کے نمونے ملتے ہیں۔ ہمارے جدید غزل گو شعراء نے بھی اس روایت کو زندہ کیا لیکن چونکہ دورِ جدید کے مطالبات نئے ہیں، اس کے تقاضے عہدِ کہنہ سے یکسر مختلف ہیں، چنانچہ اب واعظ و محتسب اور زاہد و شیخ محض علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور ان کے سہارے ظاہر پرستوں کی ریاکاری کو آشکار کیا جاتا ہے۔ تنگ نظری اور کہنگی بھی ان علائم کے سہارے واضح ہوتی ہیں۔ موجودہ عہد میں خاص طور پر مولوی کی ذات کو بطورِ خاص طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے ؎

شیخ آئے جو محشر میں تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

(ماچس لکھنوی)

حقیقت کیا ہے، یہ تو آپ جانیں یا خدا جانے
سنا ہے جمی کارٹر آپ کا ہے پیر مولانا

(حبیب جالب)

مذہب اور اس کے متعلقات پر بھی ہمارے طنز نگاروں نے کھل کر اظہار خیال کیا اور خدا کی ذات کو بھی جدید تناظر میں طنز کا بڑا نشانہ بنایا ہے۔ جدید شعراء کا خیال ہے کہ سماج و معاشرے میں جو یہ افراتفری کا ماحول گرم ہے، ہر طرف جو یہ خونریزیاں، عصمت دری، قتل و غارت گیری، فتنہ وفساد، جنگ وجدل عام ہے اس کے پیچھے صرف انسانی ذہن ہی کارفرما نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے خدا کی طرف سے بے حسی بھی اپنا کام کرتی ہے۔ چند اشعار دیکھتے چلیں جن میں خدا کی مخالفت کے پہلو شعراء کس طرح نکالتے ہیں۔

نہ اتنے زور سے سوچو کہ جاگ اٹھے وہ
خدا ابھی ہمیں تخلیق کر کے سویا ہے

(شجاع خاور)

یہ جو تکتا ہے آسماں کو تو
کوئی رہتا ہے آسماں میں کیا

(جون ایلیا)

خدا کی ذات کے ساتھ انسانی بے حسی کو بھی طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ صرف ایک شعر دیکھئے ۔

سو خوف زمانے کے سمٹ آتے ہیں دل میں
صرف ایک خدا پاک کا ڈر ہی نہیں آتا

(ارشد عبدالحمید)

مذہبی عقیدوں یا اعتقادات اور مذہبی متعلقات پر ابتدا سے ہی طنز کیا گیا ہے، لیکن ہم چونکہ ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں ان عقیدوں سے اختلاف ممکن ہی نہیں ذرا سی روشن خیالی اور تعقل پسندی کفر والحاد کے فتوے صادر کرا دیتی ہے۔ اس سلسلے میں حقانی القاسمی نے بڑی گہری اور پر معنی بات کی ہے کہ:

''عقیدوں یا عقیدتوں میں محصور معاشرہ خرد افروزی، تعقل پسندی یا آزادہ روی کی روش کو پسند نہیں کرتا۔ کسی مکیف معاشرے میں مذہبی مسلمات یا معینہ اقدار سے انحراف اور اختلاف کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔ نظری ادعائیت یا مذہبی نرگسیت تنقید یا طنز کی متحمل نہیں ہوتی، ذرا سی روشن خیالی عقلیت پرست، اعتدال پسندی کے اتہام کے لیے کافی ہوتی ہے''

(ایضاً۔ مضمون: غزل میں کفر والحاد کا تصور۔ حقانی القاسمی۔ ص 284)

اس کے باوجود بھی مذہب اور اس کے جملہ لوازمات پر وافر مقدار میں طنز کی صورتیں مل جاتی ہیں۔ اس روش پر چلنے والے شعرا میں غالب، داغ اور اقبال اہم ہیں۔ ان بزرگ شعرا نے جدید شعراء کے ماقبل ہی اپنی غزلوں میں روشن خیالی کا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ غالب کا انداز دیکھئے جس نے جنت کی حقیقت کو دل کے خوش رکھنے کا محض خیال مانا ہے ۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مذہبی موضوعات پر چند ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ۔

یہ دل کٹیا ہے سنتوں کی یہاں راجہ بھکاری کیا
وہ ہر دیدار میں زردار ہے گوٹا کناری کیا
کسی غریب کے بجھتے ہوئے چولہے میں ڈھونڈ اس کو
جو چوٹی اور داڑھی تک رہی وہ دین داری کیا

(ندافاضلی)

دور جدید کے شعراء نے صنعت تلمیح سے فائدہ اٹھا کر عصری مسائل کو ماضی کے سیاق وسباق میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جن میں لطیف طنز کا احساس ہوتا ہے ۔

بس ایک حسین کا نہیں ملتا کہیں سراغ
یوں ہر گلی یہاں کی ہمیں کربلا لگی

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

فرقہ بندی وگروہ بندی کے سبب ملک میں کئی فسادات ہوئے۔ اس پر آشوب ماحول نے سماج میں ایک طرح کی سراسیمگی، وحشت اور چیخ و پکار کی کیفیت پیدا کر دی۔ اس طرح چند حساس دل شعراء نے ان حالات کا بڑی گہرائی تک جائزہ لیا اور آخرکار کہہ اٹھے ۔

کبھی کبھی کے فسادات بھی ضروری ہیں
کہ جانور تو ہر اک آدمی میں رہتا ہے

(قاسم امام)

ہر خواب کے مکاں کو مسمار کر دیا
بہتر دنوں کا آنا بھی دشوار کر دیا

(شہریار)

مختلف موضوعات پر چند اشعار دیکھتے چلیں جن میں شعراء نے روح عصر کو کمال فنکاری کے ساتھ شامل کیا ہے کہ طنز کو راہ مل گئی ہے ۔

پہرے تمام شہر پناہوں کے ساتھ ہیں
جتنے بھی ڈاکہ زن تھے سپاہوں کے ساتھ ہیں

(افتخار امام صدیقی)

چشمِ ہر کس و ناکس
اب پرکھتی ہے پارس

(اقبال خسرو)

اردو غزل کی تاریخ میں چند نسوانی آوازیں ایسی بھی ابھری ہیں جنھوں نے صدیوں سے ظلم کی چکی میں پستی ہوئی نسوانیت کی تکالیف کو ادب میں جگہ دی ہے۔ عورتوں پر روا رکھی گئی ظلم و زیادتی، ناقدری، ناانصافی کے ساتھ مرد غالب معاشرے کے عیبوں کو بھی ان شاعرات نے اپنی غزلوں کے موضوعات بنائے ہیں۔ مذہب کی رو سے بھی عورتوں پر جو زیادتیاں ہوتی رہی ہیں ان پر بھی صدائے احتجاج بلند کیا ہے۔ غرض ان کی غزلوں میں نسوانیت اپنی تمام تر رعنائی، دلکشی و جاذبیت اور کشش کے باوجود ایک طرح کی تلخی اور شدت کا احساس بھی ہوتا ہے جو ہر ذی فہم کے احساسات کے دروازے پر دستک دیتی ہے اور اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ زیادہ تفصیل میں جائے بغیر چند شاعرات کی غزلوں سے نمونے پیش کرنے پر اکتفا کروں گی۔

ادا میں نکہتِ گل بھی نہ تھی صبا بھی نہ تھی
کہ مہماں سی رہوں اور اپنے گھر میں رہوں

(ادا جعفری)

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا
خوشبو کہیں نہ جائے یہ اصرار ہے بہت
اور یہ بھی آرزو ہے ذرا زلف کھولیے

(پروین شاکر)

نکل کے خلد سے ان کو ملی خلافتِ ارض
نکالے جانے کی تہمت ہمارے سر آئی

(نسیم سید)

وہ تو کہلایا ستارہ ٹوٹنے کے بعد بھی
میں سورج جذب کرتی تھی مگر ذرہ رہی
اس کی پہچان کھو گئی آخر
اپنے ہی گھر میں وہ رہی تنہا

(شہناز نبی)

یہاں شعرائے بنگال کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ بنگال کی سرزمین شعر و شاعری کے لیے ابتدا سے ہی بڑی زرخیز رہی ہے اور خصوصاً غزل کے باب میں یہاں کے شعراء کسی سے کبھی پیچھے نہیں رہے۔ دورِ جدید کے شعراء نے غزلوں میں اپنی عصری آگہی کے ثبوت کے ساتھ لہجے میں کاٹ داری اور نکیلا پن بھی اختیار کیا ہے جو حساس ذہن کی پیداوار کہی جا سکتی ہے۔ یہاں کے شعرا نے بھی زمانے کے بدلتے رجحانات پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور ہر طرح کی صورتِ حال کو بڑی فنکاری کے ساتھ غزل کے حسن کا حصہ بنایا ہے۔ ان کے یہاں طنزیہ عناصر موجود ہیں اس کا اندازہ ان چند اشعار سے لگائیے ؎

درس گاہوں کی خیر ہو یارب
اب تو سانچوں میں لوگ ڈھلتے ہیں

(نشاط سعید)

اچھا سا سوٹ اپنے بدن پر سجا کے وہ
خوش ہیں کہ جیسے گھر کی حالت بدل گئی

(شاہین بدر)

اس جائزے سے یہ بات تکمیل کو پہنچ جاتی ہے کہ دیگر اصناف کی طرح غزل میں بھی طنز و مزاح کے نمونے وافر مقدار میں موجود ہیں۔ البتہ طنزیاتی و مضحکاتی غزلوں کو جس معیار کا ہونا چاہیے اس میں کمی ضرور ہے لیکن وہ پست بھی نہیں ہیں۔ ہاں مگر غزل کے فن کو برتتے ہوئے تھوڑی احتیاط ضروری ہے ورنہ غزل وہ آبگینہ ہے جو ذرا سی ٹھیس سے مسمار ہو سکتی ہے۔ اس پر طنز و مزاح کا فن سوا، جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ تلوار پر چلنے کے مترادف ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی خود اپنا ہی نقصان کرا دے گی۔ بہت سے شعراء نے اس فن کو بخوبی برتا بھی ہے۔ جہاں تک آزادی کے بعد کے شعرا کی غزل گوئی کی بات ہے تو چونکہ آزادی کے بعد سے اب تک جو ماحول رہا اس کے تناظر میں مزاح کی حیثیت کم ہی رہ گئی تھی۔ اس کے بالمقابل طنز کے لیے کئی مواقع میسر آئے جس کے سبب طنز، مزاح سے الگ ہو کر الگ انداز میں غزل کی رو میں شامل ہو گئی اور مزاح محض مشاعروں تک ہی محدود رہا۔

□□□

Dr. Roushan Ara

Gopinathpur

Purulia-723128 (West Bengal)

نگہت امین

ترنم ریاض

کی افسانہ نگاری کا مختصر جائزہ

خطۂ کشمیر کی مایۂ ناز خاتون ترنم ریاض 9 راگست 1963 کو جموں کشمیر کے شہر سرینگر کے ایک علمی اور ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں ۔ان کے والد چودھری محمد اختر خاں ایک بارعب اور پر وقار شخصیت کے مالک ،نہایت خوش خلق اور ملنسار تھے ۔وہ اردو ،عربی ،فارسی اور انگریزی کے جید عالم تھے ۔ان کی والدہ ثریا خاں نہایت شفیق و رفیق اور دوست نواز خاتون تھیں ۔ترنم ریاض کی مادری زبان چونکہ کشمیری ہے ،لیکن گھر کے ادبی ماحول کی وجہ سے انھیں اردو، ہندی ،انگریزی، پنجابی اور پٹھانی زبانوں پر بھی مہارت حاصل ہے ۔انھوں نے اوائل عمری میں ہی لکھنا شروع کردیا ،زور بیان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ محض تیرہ یا چودہ برس کی عمر میں ان کا ایک افسانہ اور ایک نظم سرینگر سے نکلنے والے روزنامہ ''آفتاب'' میں شائع ہوئے ۔انھوں نے تعلیم کے ابتدائی منازل طے کرکے ایم ۔اے اور بی ۔ایڈ کی ڈگری کشمیر یونیورسٹی سے حاصل کی ۔اس کے بعد برقی میڈیا سے وابستہ رہیں ،ساتھ ہی ساتھ کہانیاں لکھیں ،شاعری کی ،علمی وادبی اور ثقافتی پروگراموں میں شرکت کرتی رہیں ۔وہ اپنی ازدواجی زندگی ریاض پنجابی کے ساتھ گزار رہی ہیں جو خود ایک افسانہ نگار ہیں ۔ترنم ریاض کا ادبی سفر ہنوز جاری وساری ہے ۔

ترنم ریاض اردو ادب کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ۔وہ بیک وقت شاعرہ ،ناول نگار ،افسانہ نگار ،تبصرہ نگار ،محقق و نقاد کی حیثیت سے اپنی قابلیت کا لوہا منوا رہی ہیں ۔افسانوی ادب میں علمی اور فکری کارنامہ انجام دے کر ہر دل عزیز ہوگئیں ۔انھوں نے جس باریک بینی سے افسانے لکھے یا جس طرح انھوں نے زبان کو پوری قوت کے ساتھ افسانوں میں استعمال

کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی معاصر خواتین میں ایک ممتاز افسانہ نگار شمار کی جاتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

"ترنم ریاض وادیٔ کشمیر کا گل نورس ہے جس نے افسانے کی دنیا میں قدم رکھا ہے جہاں زمین سخت ہے اور آسمان دور ہے۔ دنیائے ادب کی رونق کے لئے نئے فنکاروں کا 'آون جاون' بنا رہے تو بہت خوب ہے۔ فنکار اور ہر فن پارہ میرے آپ کے کہنے سے نہیں، اپنے حسن و خوبی سے زندہ رہنے کا حق چاہتا ہے، اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس حق کا احترام کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ ترنم ریاض ادب کی ہر موج سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہو سکیں۔"

(مشمولہ: ماہنامہ "شاعر"، شمارہ 04، ممبئی 2004، ص 10۔)

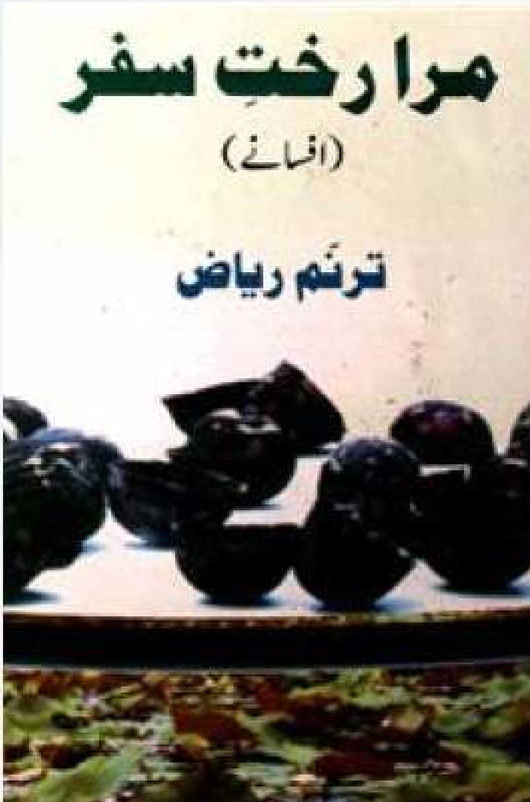

ان کی بیشتر کہانیوں میں خواتین کے احساسات و جذبات، ان کی محرومیوں، درد و کرب اور مردانہ بالادستی کے خلاف احتجاجی رویہ پیش پیش رہتا ہے۔ تانیثی ادب میں ترنم ریاض ایک معتبر نام ہے۔ ان کے افسانوں میں خود کلامی کا انداز پایا جاتا ہے۔ وہ معاشرے میں جو کچھ بھی ہیں اس کا اظہار من و عن اپنی کہانیوں میں بیان کرتی ہیں۔ انھوں نے افسانوی ادب کی دنیا میں جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "یہ تنگ زمین" (1998) "ابابیلیں لوٹ آئیں گی" (2000)، "یمبرزل" (2004) اور "میرا رخت سفر" (2008) قابل ذکر ہیں۔

پہلا افسانوی مجموعہ "یہ تنگ زمین" کی زیادہ تر کہانیاں درد و الم سے دو چار ہیں اور ایک سچے فن کار کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل افسانہ 'ناخدا' عورت کی بے بسی، مجبوری، محکومی اور لاچاری کو پیش کرتا ہے کہ کس طرح ایک عورت شوہر کے ظلم و ستم کو برداشت کرنے کے بعد ایک دن احتجاجی رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اس مجموعے میں "پورٹریٹ"، "ایک پہلو یہ بھی ہے تصویر کا"، "کلچیں"، "بلبل"، "حور"، "چھوئی موئی"، "پالنا"، "تعبیر"، "آئینہ"، "کانچ کے پردے"، "ناخدا"، "ایک تھکی ہوئی شام"، "جالے"، "کوکھ"، "کمرشیل ایریا"، "تنکے"، "پانی کا رنگ"، "گندے نالے کے کنارے"، "دھندلے آئینے" جیسے نمایاں افسانے شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کا کینوس بے حد وسیع و عریض ہے۔ ان کے اس مجموعے "یہ تنگ زمین" پر ابوالکلام قاسمی صاحب اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ:

"ترنم ریاض ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کا اظہار اور بیانیہ ان کی اپنی ذات کے ساتھ تہذیب و ثقافت اور اعلیٰ اقدار پر مبنی ہوتا ہے۔ مجھے ترنم ریاض کی کہانیوں میں روایت کے بھرپور شعور کے ساتھ تجربہ کا رنگ بھی شامل نظر آتا ہے۔ وہ صورت حال کو کہانی بنانا جانتی ہیں اور اپنے زمانے کے اسلوبیاتی رویوں سے واقفیت کے باعث کسب فیض بھی کرتی ہیں۔ مجھے ترنم ریاض کے پہلے مجموعے "یہ تنگ زمین" کی بیشتر کہانیاں ایک سچے فنکار کی ترجمانی محسوس ہوتی ہیں"۔

(مشمولہ: ماہنامہ "شاعر"، شمارہ 04، ممبئی 2004، ص 10۔)

ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "ابابیلیں لوٹ آئیں گی" نمایاں خصوصیات پر مکمل اترتا ہے۔ اس مجموعہ کی ہر تخلیق ان کے تجربے کا حصہ ہے۔ اس مجموعے میں "آدھے چاند کا عکس"، "مہمان"، "باپ"، "اچھی صورت بھی کیا"، "متاع گم گشتہ"، "اماں"، "مٹی"، "ایجاد کی ماں"، "بابل"، "پھول"، "مائیں"، "آبلو پر حنا"، "شام جی"، "برآمدہ"، "شہر"، "بجھائے نہ بجھے"، "برف گرنے والی ہے"، "شیرنی" اور "میرا پیا گھر

آیا“ جیسے افسانے شامل ہیں ۔اس مجموعے کے بارے میں ان کے خیالات بہت بلند ہیں۔

”افسانہ ”مٹی“ بے حد رنجیدہ اور غم زدہ کرتا ہے اسی طرح ”مہمان“ میں نچلے طبقے کے کرداروں کی نفسیات اور ان کی چھوٹی چھوٹی تمناؤں کو پیش کیا گیا ہے۔”افسانہ ”شہر“ جس کرب سے گزر کر لکھا ہے وہ بیان سے باہر ہے اسے خوشخط لکھنے کے خیال سے مجھ پر یاسیت طاری ہو جاتی تھی ۔افسانے کو دانستاً فراموش کرنے کی کوشش کرنا پڑتی تھی۔”ایجاد کی ماں“ اور ”میرا پیا گھر آیا“ لکھتے وقت میں نے روحانی سکھ بھی پایا تھا۔”آدھے چاند کا عکس“ لکھتے وقت میرا دل ممتا سے سرشار رہا اور ”باپ“ جیسی کہانیوں نے مجھے ذہنی تناؤ سے دوچار کیا“۔

(ترنم ریاض، ابابیلیں لوٹ آئیں گی، نرالی دنیا پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی 2000، ص 10، 11۔)

سید محمد عقیل رضوی نے اس مجموعے کے افسانے ”شہر“ کے بارے میں لکھا ہے:

”بھئی کیا کہانی لکھ دی ’شہر‘ واہ واہ! شاید اردو میں یہ پہلی کہانی مہانگری نما شہروں سے متعلق ہے۔مبارک ہو“

ابوالکلام قاسمی اس مجموعے پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

”خوشی کی بات یہ ہے کہ نیا مجموعہ ’ابابیلیں لوٹ آئیں گی‘ ان کے فنی سفر کا دوسرا پڑاؤ ہے، جو اپنے آپ میں قابلِ توجہ بھی ہے اور اپنے زمانے کے نمائندہ افسانوی رجحانات کا عکاس بھی۔مثال کے طور پر: برف گرنے والی ہے، مٹی، شہر، باپ، اماں وغیرہ۔میں ترنم ریاض کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ ان کا ادبی سفر اسی طرح جاری رہے گا“

(ترنم ریاض، ابابیلیں لوٹ آئیں گی، نرالی دنیا پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی 2000، ص 2)

تیسرا مجموعہ ”یمبرزل“ ہے ۔ اس مجموعے میں ”کشتی“، ”ڈمیٹی بیئر“، ”میرا کے شام“، ”ایسے مانوس صیاد سے“، ”رنگ“، ”تجربہ کار“، ”بی بی“، ”ہم تو ڈوبے ہیں صنم“، ”مجسمہ“، ”بالکنی“، ”آہنگ“، ”چوری“ اور ”یمبرزل“ وغیرہ افسانے شامل ہیں۔ان کہانیوں میں ایسی حیرت و مسرت پائی جاتی ہے کہ پڑھنے والا محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔ان میں جلال و جمال کے ساتھ ساتھ موسیقی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ان کی کہانیوں کا انداز جدید افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے علامتی، استعاراتی اور تجریدی ہونا چاہیے مگر ترنم ریاض نے ایک الگ راہ نکالی۔انھوں نے ان کہانیوں میں موسم، ماحول اور موضوع کی ہم آہنگی کو جس سیدھے سادے انداز میں بیان کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔سید محمد اشرف ان کہانیوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

”جذبوں کی فراوانی سے تھرتھرائی ہوئی یہ کہانیاں ایک ایسی نوعمر معصوم دوشیزہ کی طرح محسوس ہوتی ہیں جو اپنے لب کم کم وا کرتی ہے مگر اپنی گہری گہری آنکھیں کھول کر پڑھنے والے کو یکا یک دم بہ خود کر دیتی ہیں۔”مجسمہ“ کی تکنیک ”رنگ“ کا گہرا دکھ اور ”یمبرزل“ کی محبت فنا کی طرف بڑھتی محبت اردو افسانے کو دیر تک اور دور تک یاد آئے گی۔”یمبرزل“ پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے جیسے پورے افسانے کے پس منظر میں، دور وادی میں بیٹھا کوئی شخص غم انگیز آواز میں نے نوازی کر رہا ہے“۔

(ترنم ریاض، یمبرزل، نئی دہلی 2004، ص 02۔)

''مرارخت سفر'' ترنم ریاض کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں بارہ (۱۲) افسانے شامل ہیں جن میں ''حضرات وخاتون''، ''ساحلوں کے اس طرف''، ''مہاوٹیں''، ''پیش ہیں''، ''سورج مکھی''، ''چارون''، ''چمگادڑ''، ''ماں صاحب''، ''مرارخت سفر آنسو''، ''مجسمہ'' اور ''چند آرا'' جیسے افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں ایک خاص دلچسپی پائی جاتی ہے۔ اس میں زیادہ افسانے شامل نہیں ہیں، اس مجموعہ میں پہلے والے مجموعے کی دو کہانیوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان کہانیوں میں ترنم ریاض نے ایسے مناظر پیش کیے ہیں کہ بھلائے نہیں بھولتے۔ عبدالصمد لکھتے ہیں:

> ''ترنم ریاض نے افسانے کی دنیا میں بہت جلد ایک مقام بنالیا ہے۔ وجہ یہ کہ وہ اپنے فن کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ترنم ریاض بہت سوچ سمجھ کر اپنے موضوعات کا انتخاب کرتی ہیں اور انہیں بکھرنے نہیں دیتیں''۔

(مشمول: ماہنامہ ''شاعر''، شمارہ 04، ممبئی 2004، ص 10۔)

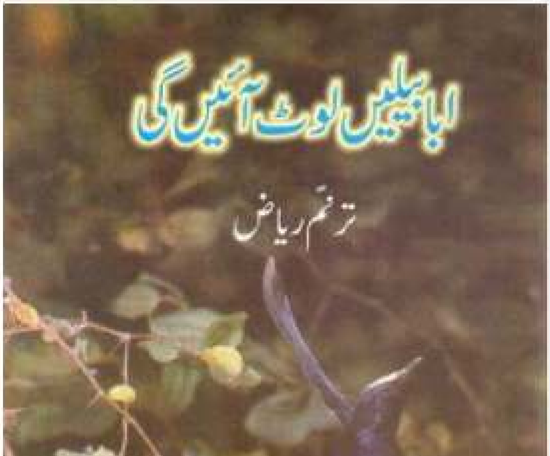

اوپر بیان کیے گئے افسانوں کے علاوہ ترنم ریاض نے ''برف آشنا پرندے'' اور ''مورتی'' جیسے ناول لکھے۔ سیاسی، سماجی، ادبی اور ثقافتی مضامین کا مجموعہ ''اجنبی جزیروں میں'' کے نام سے شائع کیا اور ایک شعری مجموعہ ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' جیسے سرمایہ سے اردو ادب کو مالا کیا۔

ترنم ریاض اپنے گرد و پیش کی تبدیلیوں سے کبھی خوش ہوتی ہیں اور کبھی افسردہ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انسانوں کے احساسات و جذبات، ان کے بدلتے ہوئے خیالات اور ان کی طرز زندگی کا بغور مشاہدہ کیا ہے اور ان احساسات کو جو لوگوں کی نظر سے پوشیدہ تھے اپنی کہانیوں اور افسانوں میں تخلیق کیا ہے۔ ترنم ریاض کو اپنے فن پر مکمل دسترس حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں کی لسانی ساخت، سادگی اور بے تکلفی بہت شفاف معلوم ہوتی ہے۔ ان کا اسلوب بیان ایسا ہے جو قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتا ہے۔ اس ضمن میں مظہر امام نے لکھا ہے کہ:

> ''ترنم ریاض کے افسانوں کی جو فضا ہے بڑی مانوس فضا ہے جس سے ہم سب واقف ہیں۔ ان کے اظہار میں کوئی تصنع آمیز صناعی نہیں ہے۔ بہت ہی صفائی اور شستگی کے ساتھ وہ اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتی ہیں۔ کہیں کہیں تو ان کے اسلوب میں خاص طرح کی مقناطیسیت آجاتی ہے جو اپنے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کو بہالے جاتی ہے۔ ترنم ریاض اپنی سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی وجہ سے ہمیں ہمیشہ متاثر کرتی ہیں''۔

(مشمول: ماہنامہ ''شاعر''، شمارہ 04، ممبئی 2004، ص 10۔)

اس طرح ترنم ریاض کی شخصیت کثیر الجہات ہے۔ وہ بے حد خوش مزاج اور حاضر دماغ ہیں۔ ان کے ارادے کی پختگی اور حوصلہ مندی بے مثال نظر آتی ہے۔ خودداری، غیرت مندی، انسان دوستی، بیباکی اور حسن پرستی جیسے قابل قدر اوصاف ان کی شخصیت کا لازمی جز ہیں۔ ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ جو کچھ ظاہر میں ہیں وہی باطن میں بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت ان کے فکشن میں پوری منعکس ہوتی نظر آتی ہے۔ ان تمام خصوصیات کی بنا پر ان کا شمار افسانوی ادب کے بلند پایہ ادیبوں میں ہوتا ہے۔

□□□

Nighat Amin
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (U.P)

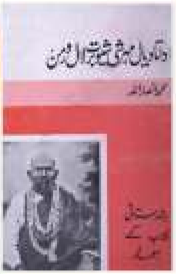

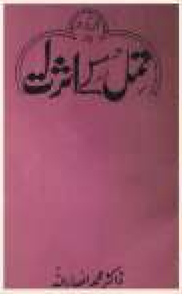

ثنا غزل

پروفیسر انصار اللہ

بحیثیت محقق

پروفیسر محمد انصار اللہ کی پیدائش اعظم گڑھ میں 4/جنوری 1936 کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، والد کا نام محمد مطیع اللہ تھا، (اپنے عہد کے تعلیم یافتہ انسان تھے، ان کے اپنے وقت کے اہم ادیبوں، شاعروں اور معزز شخصیات سے قریبی مراسم تھے۔ 1959 میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور 19/جون 1972 کو کانپور میں انتقال کیا۔) انصار اللہ کا اپنا بیان ہے کہ ''میں نے بہت جلد بولنا شروع کر دیا تھا، دو برس کی عمر میں بڑے بھائی کا سبق سن کر خود سنانے لگا تھا۔ جس وقت میں قاعدہ پڑھتا تھا، سورہ عم بڑے بھائی سے سن کر یاد کر لی تھی، قرآن پاک ختم کر کے فارسی پڑھی کریما، ما۔ تمان، قادر نامہ، وغیرہ کو زبانی یاد کر لیا تھا۔'' ماسٹر مظہر نے ریاضی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم دی اور ان کے مشورے سے محمد انصار اللہ اور ان کے بھائی محمد سمیع اللہ کو اسکول میں داخل کیا گیا۔ ملک کے بٹوارے کے بعد سمیع اللہ پاکستان چلے گئے اور بہتر تعلیم کی بدولت انگریزی کے پروفیسر ہوئے۔ محمد انصار اللہ ساتویں جماعت سے پروفیسر نذیر احمد کی سرپرستی میں رہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جب سر ضیاء الدین نے میڈیکل کالج کا منصوبہ بنایا تو اسی خیال کے پیش نظر ان کا داخلہ سائنس میں کرایا گیا۔ 1954 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد محکمۂ صنعت و حرفت میں اکاؤنٹس کی ملازمت سے آراستہ ہوئے۔

محمد انصار اللہ کو اردو سے ایک خاص لگاؤ اور وابستگی تھی چنانچہ ملازمت سے منسلک ہونے کے باوجود اردو میں تحریر و تالیف اور مضامین لکھنے کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ اسی شوق کے پیش نظر 1963 میں گورکھپور یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ (اردو) اور پھر 1966 میں پی ایچ۔ ڈی کی۔ لہٰذا (پی ایچ۔ ڈی کے لیے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اس کے مکمل ہونے کے بعد صدیق نیشنل کالج پیلی بھیت میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔) علی گڑھ شعبہ اردو کی جانب سے جب ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کی پہلی جلد شائع ہو کر ضبط ہو گئی تو اس کی تصحیح کے لیے پروفیسر آل احمد

سرور نے ان کا انتخاب کیا۔ ستائس دن تک ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کام کیا اور اٹھائیسویں دن یعنی 28 / جولائی 1967 کو شعبہ اردو میں لکچرر مقرر ہو گئے۔ 1983 میں ترقی کر کے ریڈر ہوئے، بڑے خوددار آدمی تھے کبھی کسی کا احسان لینا یا سفارش کرنا گوارانہ کیا لہٰذا 1993 میں پروفیسر کے عہدے پر فائض ہوئے اور 1996 میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ ملازمت کے بعد بھی تحقیقی و تصنیفی کام میں دلجمعی سے لگے رہے۔

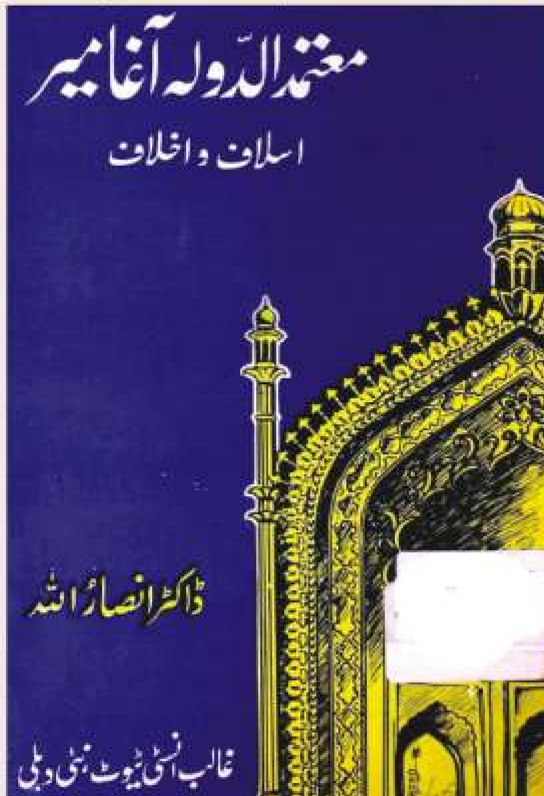

پروفیسر محمد انصاراللہ کا شمار اردو کے نامور محققین میں کیا جانا چاہیے۔ ان کے تقریباً پانچ سو تحقیقی و تعارفی مضامین ملک و بیرون ملک کے رسالوں میں شائع ہوئے۔ انھیں لکھنے کا شوق تھا اس کی ابتدا انھوں نے 1950 سے چھوٹے چھوٹے قصوں سے کی۔ پہلا مضمون نیاز فتح پوری کے رسالے ''نگار'' میں شائع ہوا آہستہ آہستہ ان کا رجحان تحقیقی مضامین کی طرف ہوا اور 1955 سے مستقل تحقیقی مضامین لکھنے لگے اور یہ سلسلہ عمر کے آخری حصے تک مسلسل جاری رہا۔ ان کو اردو سے اس قدر محبت تھی کہ کتابیں محض شوق کی خاطر اپنی جیب سے شائع کرا دیتے تھے۔ ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا میرے حال پر بڑا احسان یہ ہے کہ نادر تحقیقی نکتے خود بخود ذہن میں آجاتے ہیں۔۔۔ میں نے بیشتر کتابیں محض اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے اپنے خرچ سے چھپوائی ہیں''۔ (نیا دور، لکھنؤ، جنوری 1992، ص 7)

پروفیسر محمد انصاراللہ نے سو سے زائد کتابیں تصنیف و ترتیب کیں، بابائے اردو مولوی عبدالحق کی روش پر چل کر بہت سی قدیم کتابوں کو جدید ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے شائع کرائیں۔ ان کی پزیرائی ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی ہوئی، مشہور محقق اور تاریخ ادب اردو کے خالق ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ یہاں چند اہم کتابوں کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے تاکہ اردو تحقیق میں پروفیسر محمد انصاراللہ کی خدمات کا کچھ حد تک احاطہ کیا جا سکے۔

''اردو صرف'' (1975) ''اردو نحو'' (1975) دونوں کتابیں اردو قواعد کے متعلق ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ابتدائی درجات کے طلبہ کے لیے قواعد کافی مشکل فن رہا ہے۔ چنانچہ اسی ضرورت کے پیش نظر ان کتابوں کو تیار کیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں محمد انصار اللہ نے اردو قواعد آسان لفظوں میں بیان کی ہے۔ یہ دونوں کتابیں اردو قواعد کے لیے حد درجہ مفید اور کارآمد ہیں۔ طبع ثانی کے پیش لفظ میں مصنف لکھتے ہیں:

''یہ رسالہ '' اردو صرف'' میں نے اب سے بارہ برس پہلے 1975ء میں اسدیار خان صاحب مالک ایجوکیشنل بک ہاؤس کی فرمائش سے ابتدائی درجات کے طالب علموں کے لیے مرتب کیا تھا۔''

(اردو صرف، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 2012 (ص 14)

''تاریخ ادب اردو'' (16-2012) ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کے تحت تاریخ ادب اردو کی تصنیف کا جو پروجکٹ شروع کیا گیا تھا اس کی ابتدائی پانچ جلدیں (ابتدا سے 1700 تک) سیدہ جعفر اور گیان چند جین نے مشترکہ طور پر تصنیف کیں اسی پروجکٹ کی جلد نہم سے جلد سترہ تک (1811 سے 1911 تک) محمد انصاراللہ نے تنہا تخلیق کیا۔ نو جلدوں پر مشتمل ان کا یہ تخلیقی کام انیسویں صدی کی زبان اور نثر و نظم کا احاطہ کرتا ہے جو کہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول مصنف:

''اردو ادب کی تاریخ کو (1221ھ/1806ء 1253ھ/1837ء) علاقائی تقسیم کے ساتھ اس طور پر مرتب کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔''

(تاریخ ادب اردو، 1858 تا 1914، ص: vi)

''جامع التذکرہ'' تین جلدوں پر مشتمل یہ کتاب بھی محمد انصار اللہ کا اہم کارنامہ ہے جو کہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' سے شائع ہوئی ہے۔

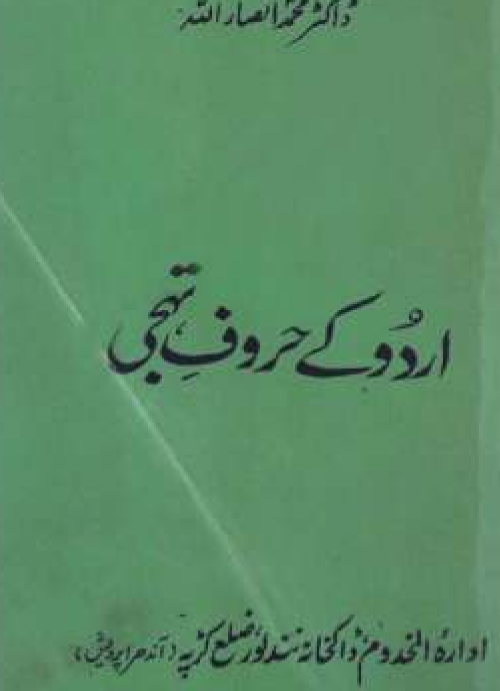

''اردو میں تدوین'' (2014) یہ محمد انصار اللہ کے ان اہم مضامین کا مجموعہ ہے جو رسالوں میں شائع ہو چکے تھے ان مضامین کی تعداد ستر ہے۔ حالاں کہ ان کے علاوہ بھی ان کے سیکڑوں اہم مضامین مختلف رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں یکجا صورت میں منظر عام پر لایا جائے تاکہ قارئین اس سے استفادہ کرسکیں۔

''غالب ببلیوگرافی'' (1998) محققین کے لیے اہم تحفہ ہے۔ اس کتاب میں مرزا اسد اللہ خان غالب سے متعلق کتابوں کے نام، متفرق تصانیف، رسالوں میں شائع مضامین، ایم۔ اے، ایم۔ فل، پی ایچ۔ ڈی کے مقالے، رسالوں کے غالب نمبروں کے علاوہ دوسری زبانوں مثلاً (اطالوی، انگریزی، بلوچی، بنگلہ، جرمن، روسی، عربی، فارسی، فرانسیسی، مرہٹی، ہندی اور یوکرین) میں غالب سے وابستہ اس وقت تک کی تخلیقات کا اس میں احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول ''غالب سے متعلق کتابیں'' حصہ دوم ''کتابوں میں غالب'' حصہ سوم ''رسالوں کے مضامین'' آخر میں ضمیمہ اور اشاریہ شامل ہے۔

''مونوگراف'' داتا دیال مہرشی شیو برت لال ورمن (1991) یہ کتاب ساہتیہ اکادمی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف نے اس میں داتا دیال کی زندگی اور شخصیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے جسے ڈاکٹر عزیز پریہار نے کیا ہے۔

''معتمد الدولہ آغا میر اسلاف و اخلاف'' (1988) یہ کتاب بھی غالب سے متعلق ہے جو غالب انسٹی ٹیوٹ سے 1988 میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں اس کی اہمیت اور وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے ''محمد شفیع قریشی'' (سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ) لکھتے ہیں:

> ''اودھ کی حکومت میں معتمد الدولہ کی اس وقت بڑی حیثیت تھی اس کے باوصف اب تک ان کے حالات پر کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر انصار اللہ کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے توقع کی جاتی ہے کہ اس طرح اودھ کی اس معروف شخصیت کے حالات سے بہت سے لوگ تفصیل کے ساتھ واقف ہوسکیں گے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے پروگرام میں بات بھی شامل ہے کہ ایسی کتابیں شائع کی جائیں جن سے غالب اور عہد غالب کو سمجھنے میں مدد ملے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔''

(ص6) ''معتمد الدولہ آغا میر اسلاف و اخلاف''

''پدماوت کی مختصر فرہنگ'' (1972) مصنف (ملک محمد جائسی) پدماوت اودھی زبان میں 1540 میں لکھی گئی۔ اس میں چتوڑ کے راجہ رتن سین اور رانی پدماوتی کی محبت کا قصہ اور علاوء الدین خلجی کے رانی پدماوتی کے عشق میں مبتلا ہونے اور چتوڑ کے قلعے پر چڑھائی کی داستان ہے۔ محمد انصار اللہ نے اس کی فرہنگ تیار کی ہے۔ یہ کتاب لیتھوکلر پرنٹرس علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ فرہنگ کو اردو کے حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ محمد انصار اللہ اس کتاب کی تصنیف سے متعلق لکھتے ہیں کہ ''یہ فرہنگ اپنے ذاتی مطالعہ کے لیے تیار کی تھی۔ اپنے دوست مولانا نہال مختومی کی ہمت افزائی پر شائع کروایا۔'' اس کتاب کی ایک اہم خاصیت یہ ہے کہ لفظ کا لغوی معنی نہ لکھ کر اس کا مطلوب معنی لکھا گیا ہے۔ اس کے مقدمہ میں ملک محمد جائسی اور ان کی تصانیف کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

''شعرائے اردو کے اولین تذکرے'' (1978) اس کتاب میں ان تذکروں کا ذکر کیا گیا ہے جو اولین تذکروں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ کتاب بھی لیتھوکلر پرنٹرس علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب پر

اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے بھی نوازا۔ صاحب مصنف نے کتاب میں صنف تذکرہ کی اہمیت اور تاریخ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ لہٰذا اس کے مقصد اور معنی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تذکرے تاریخ، سوانح یا تنقید کی کتابیں نہیں ہیں اس لیے ان سے ان توقعات کا وابستہ کرنا جو تاریخ، سوانح یا تنقید کے ساتھ مختص ہیں بیجا ہے۔ ان کا مقصد پڑھنے والے سے مجملاً بعض شاعروں کو متعارف کرا دینا ہوتا ہے اور بس لفظ ''تذکرہ'' خود اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ اس کتاب میں کسی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔'' (ص8)

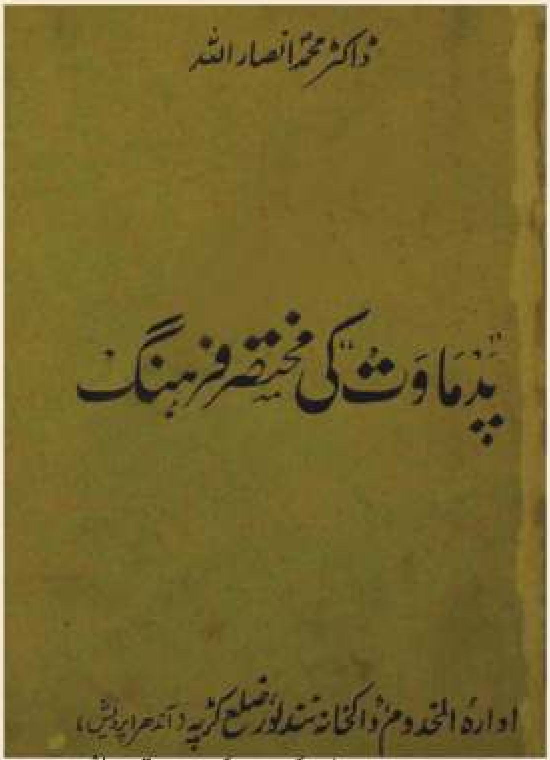

کتاب میں درج ذیل تذکروں کا ذکر ہے۔ ''تحفۃ الشعرا'' (مرزا افضل بیگ)، ''گلشن گفتار'' (خواجہ خان حمید)، ''گلشن راز'' (فتح علی خان)، ''نکات الشعرا'' (میر تقی میر)، ''مخزن نکات'' (شیخ محمد قایم چاندپوری) اور ''ریاض حسینی'' (عنایت اللہ فتوت)۔ مصنف نے ان تمام تذکروں کے طریق کار پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔

محمد انصار اللہ ایک اہم مدون بھی تھے انھوں نے اردو اور فارسی کے درجنوں قدیم مخطوطات اور غیر مطبوعہ نسخوں کو تدوین کے مراحل سے گزار کر شائع کیا ہے۔ ''تلخیص معلی'' (کلب حسین خان نادر) دو جلدوں میں۔ ''زبان ریختہ'' (عبدالغفور خان نساخ) ''برہن کی کہانی'' (مقصود لکھنوی) برہن کی کہانی ایک بارہ ماسہ ہے جس میں بارہ ماسہ کی اہمیت و افادیت اور ارتقا سے متعلق تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ صاحب مرتب لکھتے ہیں:

''بارہ ماسہ میں فراق کی کیفیات کا بیان ہوتا ہے۔ تنہائی کا احساس اور محبوب سے ملاقات کی تمنا بس یہی بارہ ماسہ کا مقصد اور موضوع ہوتا ہے۔ (ص22)

محمد انصار اللہ ایک عمدہ ترجمہ نگار بھی تھے۔ انھوں نے ہندی اور سنسکرت کی کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ''کبیر پداولی'' (مصنف ڈاکٹر رام کمار ورما) کا ترجمہ ''شعر کبیر'' کے نام سے کیا ہے۔ کبیر پداولی گرو گرنتھ صاحب سے ماخوذ کبیر کے کلام کا مستند مجموعہ ہے۔

محمد انصار اللہ کو ابتدائی زمانے میں شاعری کا شوق بھی ہوا وہ نظر تخلص کرتے تھے حالاں کہ وہ شاعری میں کچھ خاص پہچان بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تک بندی سے شعر گوئی کی ابتدا کی اور چند نظموں اور غزلوں پر اس کا اختتام ہو گیا۔ ان کے مطابق 1953 سے شعر کہنے لگے تھے، شاعری کے استاد شفیق جونپوری (م/1963) تھے۔ شفیق جونپوری کے انتقال کے بعد شعر گوئی ہمیشہ کے لیے ترک کر دی۔ اس طرح ان کی شاعری کا زمانہ محض دس سالوں پر محیط ہے۔

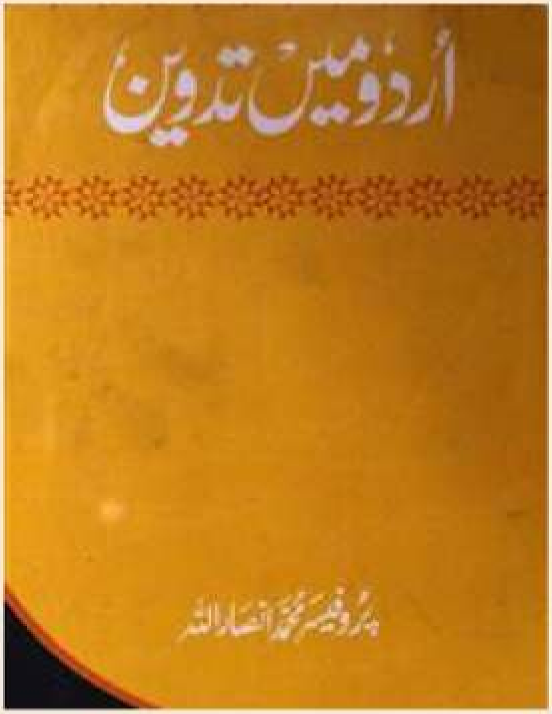

پروفیسر محمد انصار اللہ کو اردو ادب میں ان کی علمی ادبی اور تخلیقی خدمات کے صلے میں متعدد ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فہرست ملاحظہ کریں:

انعامات مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ (1988) برائے، معتمد الدولہ، اسلاف اور اخلاف

اتر پردیش اردو اکیڈمی برائے پدماوت کی مختصر فرہنگ، قاعدہ ہندی ریختہ عرف رسالہ گلکرسٹ اور صہبائی ایک مختصر تعارف

امتیاز میر کل ہند میر اکیڈمی، لکھنؤ، (1985)

نوائے میر کل ہند میر اکیڈمی، لکھنؤ، (1993)

فخر الدین علی احمد، غالب انعام از غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی (2009) برائے اردو تحقیق وتنقید

محمد انصار اللہ نے ایک طویل مدت اردو ادب کی خدمت میں صرف کی، ان کی بدولت اردو کے سرمایہ میں کافی اضافہ ہوا۔ ان کی گراں قدر ادبی خدمات کے باوجود اب تک ان کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو کے اس جاں باز قلم کار کی تخلیقات اور کارناموں کو منظر عام پر لائیں یہی ان کے تئیں سچا خراج عقیدت ہوگا۔

طویل علالت کے بعد اکیاسی برس کی عمر میں پروفیسر محمد انصار اللہ کا انتقال 22/ اکتوبر 2017 کو علی گڑھ میں ہوا۔ ان کے چھ بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ ان کی تدفین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

(بحوالہ: اردو بک ریویو، اکتوبر تا دسمبر 2017)

□□□

Sana Gazal
Research Scholar Urdu (BHU)
N13/14-3K
Ansar Nagar Nai Basti
Saraisurjan, Bajardiha
Varanasi Pin-221106 (U.P)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.......................... بتاریخ..........................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

کہانی

ڈاکٹر رینو بہل

دل میں رب بستا

بظاہر چاروں طرف سکون ہے، خاموشی ہے۔ خاموشی بھی ایسی کہ ایک مدت بعد پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں ہیں جو دنیا کے شور میں کہیں دب کے رہ گئیں تھیں مگر حقیقت میں انسان خوفزدہ ہے شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو رہا ہے۔ مکمل لاک ڈاؤن کی وجہ سے لوگ اپنے گھروں میں قید ہیں۔ دنیا کی رفتار تھم گئی ہے۔ سڑکیں سنسان ہیں۔ شہر کی ویران خاموش فضا کی مہک شہر کی حد سے جنگلوں تک پہنچ گئی ہے۔ اسی لیے رات کو بھولے بھٹکے کبھی لومڑی کبھی چیتا تو کبھی بارہ سنگھا شہر کی سڑکوں پر گھومتے نظر آنے لگے ہیں۔ فضا کی آلودگی غائب ہوتے ہی آسمان صاف اور شفاف نظر آنے لگا ہے۔ فضا تروتازہ ہے۔ آج پرندے آزادی سے بے خوف کھلے آسمان میں اڑ رہے ہیں اور جانور سڑکوں پر گھوم رہے ہیں۔ انسان گھروں میں رہنے کو مجبور ہے۔ اپنوں سے ملنے سے کترا رہا ہے۔ رابطے کا ذریعہ صرف فون اور موبائل ہی رہ گیا ہے۔

رات کو نو بجے گایتری نے فون پر بتایا کہ پروفیسر صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ سن کر بے حد افسوس ہوا۔ تقریباً تین ہفتے پہلے ہی انھیں اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ پروفیسر صاحب گایتری کے پڑوسی اور ہمارے اوپر والے فلیٹ میں رہتے تھے۔ اس رات گھر کے باہر ایمبولینس آئی تو پتا چلا کہ پروفیسر صاحب ایک ہفتے سے بیمار تھے جب حالت زیادہ خراب ہو گئی تو پڑوسی کو فون کر کے مدد مانگی۔

پچھلے بیس سالوں سے ہم انھیں اکیلا رہتے دیکھتے آئے ہیں۔ کسی سے کوئی رسم و راہ نہیں رکھی۔ صرف ایک نوکرانی ان کے گھر پر روز صاف صفائی، کپڑے دھونے اور کھانا بنانے آتی تھی۔ اگر سیڑھیاں اترتے چڑھتے ان سے سامنا ہو جاتا تو احتراماً ان سے دعا سلام کر لیتے جس کا جواب صرف سر کی جنبش سے بنا مسکرائے دے کر آگے بڑھ جاتے۔ پروفیسر صاحب کو دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ کبھی ایسے شخص کو بھی کسی سے عشق ہو سکتا ہے اور وہ بھی ایسا دیوانہ کہ اپنے سے آٹھ سال عمر میں بڑی لڑکی کے لیے زندگی کا رخ بدل دیا۔ بات ان دنوں کی ہے جب وہ جوان تھے، یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اپنے ہی ڈپارٹمنٹ کی ایک لیکچرر کو دل دے بیٹھے اور پھر اسے پانے کی چاہت میں بچپن سے اپنا جج بننے کا خواب خود ہی توڑ کر اسی لاء ڈپارٹمنٹ میں لیکچرر بن گئے۔ معلوم نہیں ان کی شادی کتنے سال قائم رہی اور پھر جدائی کا سبب کیا بنا۔ بس اتنی خبر ہے کہ ایک بیٹی ہے جو امریکہ میں ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ سال میں تین چار ماہ کے لیے پروفیسر صاحب امریکہ بیٹی سے ملنے جاتے اور ان کے یہاں ہی قیام کرتے۔ دو سال پہلے جب وہ امریکہ گئے تو لمبے عرصے تک نہ لوٹے اور جب واپس آئے تو ان کے ساتھ ان کی بیٹی بھی تھی۔ اس کی ماں کا ایک لمبی بیماری کے بعد انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت پروفیسر صاحب بھی وہیں تھے اور اسی لیے بیٹی کو ساتھ لے آئے۔

پڑوسی ہونے کے ناطے گایتری اور کمار نے اس لڑکی سے ملنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھی بالکل اپنے باپ کی بیٹی نکلی خشک، بدلحاظ اسے لڑکی کہنا شاید مناسب نہ ہوگا۔ اسے دیکھ کر اس کی اصل عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ شاید چالیس کی شروعاتی عمر میں ہوگی۔ درمیانہ قد، بھرا جسم، صاف رنگت، لمبے بال اور بیچ میں سے سیدھی مانگ نکال کر چوٹی بنائی ہوئی۔ نہ لباس سے نہ شکل سے نہ لب و لہجہ سے کہیں سے بھی وہ امریکہ میں پلی بڑھی نہ لگتی۔ کبھی کبھی ذہنی پریشانی کی شکار لگتی یا کبھی ذہنی معذور لگتی۔ سنا ہے پڑھی لکھی ہے۔ نہ شادی ہوئی تھی اور نہ ہی کہیں ملازمت کرتی تھی۔ صبح دو گھنٹے

کے لیے گھر سے باہر ضرور جاتی اور باقی کا دن گھر پر ہی گزارتی۔ گھر کا کام کاج بالکل نہیں آتا تھا لہٰذا نوکرانی ہی حسب معمول سب کام کرتی۔

پروفیسر صاحب نے چھ مہینے بعد اپنی پرانی کھٹارا کار بیچ کر بیٹی کو نئی گاڑی دلا دی تھی۔

ایک روز باورچی خانہ کی چھت سے پانی ٹپکنے لگا تو مجھے مجبوراً ان کے گھر جانا پڑا۔ گھنٹی کے جواب میں پروفیسر صاحب نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی ماتھے پر بل پڑ گئے۔ سلام کا جواب دیے بغیر پوچھا:

’اب کیا ہوا؟‘ ان کا لہجہ ایسا تھا جیسے کوئی خیرات لینے آیا ہو۔

’ہماری چھت پھر ٹپکنے لگی ہے۔‘

سر کی جنبش سے اندر آنے کا اشارہ کیا اور بیٹی کو آواز لگائی۔ ’مکی‘

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو خود دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

میرے ہیلو کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بالکل باپ کی طرح اس کی پیشانی پر بھی سلوٹیں ابھری ہوئی تھیں۔ اس نے اخلاقاً بیٹھنے تک کو نہ کہا۔

میری بات سننے کے بعد بڑی بے رخی سے جواب دیا:

’ہمارے یہاں پانی نہیں رکا کوئی اور مسئلہ ہوگا۔‘

’پہلے بھی کئی بار اسی طرح ہوا ہے۔ آپ صرف اپنی نوکرانی کو کہہ دینا کہ وہ نالی اچھے سے صاف کر دے۔ سارا کوڑا یہ نالی میں ہی پھینک دیتی ہیں۔‘

’’کہہ دوں گی۔‘

اس کی شکل، اس کا لہجہ میری برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ میں پلٹنے لگی تو وہ گویا ہوئی:

’آپ کا اس کمرے کا پنکھا بہت آواز کرتا ہے میں رات بھر سو نہیں پاتی۔ آپ کو خیال رکھنا چاہیے۔‘ اس نے دائیں طرف والے بیڈروم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’مجھے خواب تو نہیں آتا تھا۔ آپ مجھے بتا دیتی۔ میں پنکھا ٹھیک کرا لیتی۔‘ میں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

’آپ کو خود دیکھنا چاہیے۔ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہیے۔‘

’بالکل۔ میں بھی یہی کہہ رہی ہوں۔‘ اتنا کہہ کر میں باہر جانے کو پلٹی۔ میرے نکلتے ہی اس نے غصے سے دروازہ زور سے بند کیا۔

پہلی دفعہ اتنی ذلت محسوس ہوئی کہ دل میں فیصلہ کر لیا کہ کتنا ہی بڑا مسئلہ کیوں نہ ہو اب اس کے گھر قدم نہیں رکھوں گی۔

ایک رات کمار کو پروفیسر صاحب نے فون کر کے بتایا کہ ’میری طبیعت بہت خراب ہے ہو سکے تو آ جاؤ۔‘ فون بند ہوتے ہی وہ ان کے گھر پہنچ گیا۔ مکی نے دروازہ کھولتے ہی بے رخی سے پوچھا۔

’کیا کام ہے؟‘

’پروفیسر صاحب سے ملنا ہے۔‘

’وہ سو رہے ہیں۔‘ اتنا کہہ کر وہ دروازہ بند کرنے لگی تو وہ زبردستی اندر چلا گیا۔

’انھوں نے فون کر کے بلایا ہے۔ طبیعت خراب ہے ان کی۔‘ اتنا کہتے ہوئے اس کی پرواہ کیے بغیر ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

لائٹ آن کی تو دیکھا پروفیسر صاحب بستر پر نڈھال پڑے تھے اور بستر قے سے گندا، بدبودار ہو رہا تھا۔ مکی نے دیکھتے ہی کہا۔

’آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ اسے کیوں فون کیا؟‘ اس کے لہجے میں غصہ تھا۔

پروفیسر صاحب کا چہرا زرد پڑا تھا۔ آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔

’کب سے طبیعت خراب ہے آپ کی؟‘

’تین دن سے ایسے ہی ہیں۔ پتا نہیں باہر سے کچھ کھا کر آئے تھے۔ بدہضمی ہو گئی۔‘ مکی نے ہی پروفیسر صاحب کی جگہ جواب دیا۔ ان کی حالت جواب دینے کی بھی نہیں تھی۔ آنکھیں بند کیے وہ لیٹے رہے۔

کمار نے دو تین ڈاکٹروں سے بات کرنے کی کوشش کی مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔

’میں کسی ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔‘ رات سر پر تھی اور طبیعت زیادہ خراب۔ بغیر وقت گنوائے وہ نکل گیا۔

ایک گھنٹے بعد وہ صرف دوائی لے کر آنے میں کامیاب ہوا۔ کوئی بھی ڈاکٹر آنے کو راضی نہ تھا۔

’یہ دوائی ابھی کھلا دو۔ رات آرام سے سو جائیں گے صبح دیکھتے ہیں۔‘

بستر بدل کر پروفیسر صاحب کو مکی نے لیٹنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ ایک خوراک اپنے سامنے کھلا دی اور باقی سمجھا کر وہ وہاں سے نکل آیا۔

’اگر رات کو کوئی تکلیف ہو تو بے جھجک ہمیں اٹھا لینا۔‘

حسب معمول مکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ رات پروفیسر صاحب نے بڑی تکلیف میں گزاری۔ کمار کو تو تب معلوم ہوا جب وہ ناشتے کے بعد ان کا حال دریافت کرنے گیا۔

’مجھے بلا لیتے، اسی وقت اسپتال لے جاتے۔‘

’میں نے اپنے چاچا کو فون کر دیا تھا وہ ابھی آتے ہی ہوں گے۔‘

’کمار نے حیرت سے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا۔ بیس سالوں

میں شاید ایک یا دو دفعہ ہی اس نے ان کے بھائی کو وہاں دیکھا ہوگا۔

'اب ان کا انتظار کرنا ہے یا اسپتال جانا ہے؟' کمار نے کمی سے پوچھا۔

'مجھے تم ابھی لے چلو۔' پروفیسر صاحب بہ مشکل بولے۔

کمی نے ایک نظر باپ کی طرف ناگواری سے دیکھا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

ایک گھنٹے کے بعد اسپتال سے ایمبولینس آئی۔ پروفیسر صاحب کے بھاری بھرکم جسم کو اسٹریچر پر ڈال کر تیسری منزل سے لانا آسان کام نہیں تھا۔ تب تک ان کا بھائی نہیں آیا تھا۔

کمار انھیں اسپتال داخل کروا کر دوپہر تک لوٹ آیا تھا۔ اطمینان اس بات کا تھا کہ اب وہ ڈاکٹروں کے محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔

اُدھر پروفیسر صاحب اسپتال میں داخل ہوئے ادھر کرونا وائرس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نامراد وبا نے پوری دنیا کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ خوفناک خبریں دل دہلانے لگیں، موت کا بازار گرم ہو گیا۔ گھر اجڑنے لگے، شہر ویران ہو گئے۔ کاروبارِ حیات بند ہو گیا۔ زندگی تھم سی گئی۔ پورے ملک میں لاک ڈاؤن عائد کر دیا گیا۔

پروفیسر صاحب جو اس روز گھر سے نکلے تو پھر لوٹ کر نہ آسکے۔ تین ہفتے اسپتال میں رہنے کے بعد ان کے انتقال کی خبر ہی آئی۔ اسپتال سے پروفیسر صاحب کے بھائی نے کمار کو فون پر اطلاع دی تھی۔

خبر سن کر میرا دل بھی دھک سے رہ گیا۔ اُف اس بے چاری کے ساتھ کتنا ظلم ہوا۔ بھری دنیا میں بالکل تنہا ہو گئی۔ باپ کی شفقت بھری ٹھنڈی چھاؤں میں بے چاری محفوظ زندگی بسر کر رہی تھی۔ ایک دم سے تنہا ہو گئی۔ رات دس بجے میں نے کمی کو کسی کے ساتھ گھر کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ دل تو چاہا اسی وقت اس کے پاس چلی جاؤں مگر چاہتے ہوئے بھی ہمت نہ کر سکی۔ جانتی تھی گایتری اور کمار سب سنبھال لیں گے۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے لوگ اپنے ہی گھروں میں قید ہو گئے تھے کوئی بھی اسپتال سے لوٹی اس لڑکی کے گھر جانے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ لوگوں سے فاصلہ رکھنا بھی لازمی تھا۔ رات جب جب آنکھ کھلتی تو خیال اسی کی طرف جاتا۔

صبح 11 بجے کے قریب ہمت جٹا کر افسوس کے لیے اس کے گھر پہنچی تو باہر تالا لٹک رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر گایتری باہر آگئی۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

'بنا بتائے نکل گئی۔ کمار نے تو رات کو کہا تھا کہ اکیلے مت جانا میں ساتھ چلوں گا۔'

'رات میں نے دیکھا تھا جب وہ لوٹی تھی۔ اس کے ساتھ بھی تو تھا کوئی؟'

'اٹینڈنٹ تھا (جسے پروفیسر صاحب کے لیے رکھا تھا)۔ ہمیں تو امید نہیں تھی کہ گھر آئے گی۔ کمار نے اس کے چاچا کو کہا تھا کہ رات اسے اپنے گھر لے جائے بے چاری ایسی حالت میں کیسے تنہا رات کاٹے گی۔ مگر دیکھو لوگوں کے خون کتنے سفید ہو چکے ہیں۔

'انھوں نے ایک دفعہ بھی اسے اپنے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ مجبوراً وہ گھر لوٹ آئی۔ اپنوں سے تو بیگانے اچھے۔ ایسے وقت میں اکیلا تو نہیں چھوڑا اس نے۔'

'اور کوئی رشتے دار نہیں؟'

'باہر سے تو کوئی آ نہیں سکتا۔ یہاں کا مجھے صرف چاچا کا معلوم ہے۔ ہم نے تو کہا تھا رات ہمارے پاس ہی رک جائے مگر مانی ہی نہیں۔ نہ چائے پی نہ کھانا کھایا۔ کہتی تھی کھا کر آئی ہوں۔ کمار نے کہا تھا اکیلے مت جانا میں صبح ساتھ چلوں گا مگر بنا بتائے اکیلی ہی گاڑی اٹھا کر سیدھے شمشان گھاٹ کے لیے نکل گئی۔ مارچری سے چاچا سیدھے پروفیسر صاحب کو شمشان گھاٹ لے کر پہنچ جائیں گے۔'

'چار لوگوں سے زیادہ کو تو اجازت بھی نہیں ملتی وہاں جانے کی۔'
میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

'تبھی تو کوئی گیا نہیں۔'

میں بھاری قدموں سے واپس لوٹ آئی۔ یہ تو شکر ہے پروفیسر صاحب کی موت کرونا کی وجہ سے نہیں ہوئی اسی لیے چار لوگ تو شامل ہو گئے ورنہ اس بے چارے کو کندھا دینے کے لیے چار لوگ بھی نصیب نہیں ہوتے۔ شہر میں کرونا کے پہلے مریض کی موت ہوئی تھی۔ اسپتال کی گاڑی میں مردہ باپ کو لے کر بیٹا انتم سنسکار کے لیے شمشان گھاٹ پہنچ گیا۔ گاڑی سے بجلی مردہ گھر کا فاصلہ صرف پندرہ قدموں کا تھا مگر اس فاصلے کو طے کرنے کے لیے بیٹے کو دو گھنٹے خوار ہونا پڑا۔ ارتھی کو کوئی ہاتھ لگانے کو تیار نہ تھا۔ بیٹے نے گاڑی میں آئے اسپتال والوں سے، محکمہ صحت کے کارکنوں سے، شمشان پر کام کرنے والے لڑکوں کی بڑی منت کی مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر میں شمشان کے انچارج نے کمشنر کو فون کیا۔ محکمہ صحت سے دو افراد آئے اور دو لوگوں کو حفاظتی کِٹ دی تب جا کر وہ آگے آئے۔ پھر بھی وہ مردہ چار کی بجائے تین کاندھوں پر ہی اپنی آخری منزل تک پہنچ سکا۔ یہ باپ تو پھر خوش نصیب تھا جس کا انتم سنسکار اس کے بیٹے نے کیا ساتھ

والے شہر میں تو گھر والوں نے اس عورت کے مردہ جسم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو کرونا کی چپیٹ میں آنے سے پہلے کسی کی ماں کسی کی بہو ہوا کرتی تھی۔ کرونا کی زد میں آتے ہی سب رشتوں نے آنکھیں موند لیں اور میونسپلٹی والوں نے لاوارث لاش کی طرح اس کو سپردِ آتش کیا۔

تیسرے روز گایتری نے فون پر بتایا کہ مکی کے گھر کا دروازہ کھلا ہے اگر چاہو تو افسوس کرنے آسکتی ہو۔

اس کے گھر جانے سے پہلے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا کہ ہو سکتا ہے وہ بدمزاج، بدلحاظ دروازہ ہی نہ کھولے یا پھر سیدھے منہ بات بھی نہ کرے مگر پھر بھی میں افسوس کے لیے ضرور جاؤں گی۔ مجھے اس مکی سے نہیں بلکہ اس بیٹی سے ہمدردی تھی جس نے اپنے اکلوتے سہارے اپنے والد کو کھو دیا تھا۔ ایسے مشکل وقت میں وہ بالکل تنہا ہے کوئی اسے دلاسا دینے والا بھی نہیں۔ بڑے شہروں میں لوگ فاصلوں سے ملنا پسند کرتے ہیں چھوٹے شہروں والی رشتوں کی گرماہٹ یہاں کہاں؟ دو روز پہلے ہی یوپی کے ایک چھوٹے سے قصبے میں مندر کے پجاری کا انتقال ہو گیا۔ لاک ڈاؤن کے باوجود محلے کے لوگ پرسا کے لیے ان کے پاس پہنچ گئے۔ باہر سے کسی رشتے دار کا آنا ممکن نہ تھا۔ بیٹا کوئی تھا نہیں اور بیٹیوں کو سنسکار کرنے کی اجازت نہیں۔ لہٰذا ہمسایوں نے مل کر اس کی ارتھی کو کاندھا دیا اور انتم سنسکار بھی انھوں نے ہی کیا۔ اس وقت نہ مرنے والا براہمن تھا نہ انتم سنسکار کرنے والے مسلمان۔ اس وقت وہ صرف انسان تھے، دوست تھے پڑوسی تھے اور مذہب کی حدود سے پرے۔

اپنی انا کو درکنار کر ہمت کر کے میں اس سے ملنے چلی گئی۔ بیل بجا کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ پانچ منٹ بڑی کشمکش میں گزرے۔ دروازہ کھولتے ہی بڑی حیرت اور ناگواری سے مجھے دیکھتے ہوئے بے رخی سے پوچھا:

’ہاں کیا بات ہے؟‘

چہرہ مرجھایا ہوا رنجیدہ ضرور تھا مگر ماتھے پر بل برقرار تھے۔ اس نے سوچا ہوگا میں شاید پھر کوئی مسئلہ لے کر آئی ہوں۔

’پروفیسر صاحب کا سن کر بڑا افسوس ہوا۔‘ میں نے دروازے پر ہی کھڑے کھڑے افسوس کر دیا۔

کرخت چہرہ نرم پڑ گیا۔ پیشانی کے بل کم ہو گئے۔ دروازہ کھول کر اس نے مجھے اندر آنے کو کہا۔ پہلی دفعہ میں نے اسے کسی نارمل انسان کی طرح بات کرتے دیکھا۔ بات باپ سے شروع کی تھی مگر زیادہ تر باتیں وہ اپنی ماں کی کرتی رہی۔ ماں کی موت سے جڑی تفصیل سناتی رہی۔ شاید ماں کی کمی زیادہ محسوس کر رہی تھی۔ ماں سے بچھڑنے کے زخم پھر سے ہرے ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی صدمے کی وجہ سے یا تو انسان بالکل خاموش ہو جاتا ہے یا پھر ضرورت سے زیادہ بولتا ہی جاتا ہے۔ وہ چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ دیواروں سے باتیں کرتا جب تنہا انسان تھک جاتا ہے تو موقع ملتے ہی اگلی پچھلی کسر نکالنے میں گریز نہیں کرتا۔

سانس لینے کو جب وہ رکی تو میں نے پوچھ لیا:

’کوئی اور بہن بھائی نہیں ہے؟‘

’اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔‘

’بہت بڑا دکھ ہے آپ کا۔ رب آپ کو یہ دکھ سہنے کی ہمت عطا کرے ہم تو یہی دعا کر سکتے ہیں۔‘

’میرے پاپا تو اپنی عمر گزار کر گئے ہیں افسوس تو ان کا ہے جو بے وقت مر رہے ہیں۔ میں جانتی تھی آج نہیں تو کل مجھے تو تنہا رہنا ہی ہے مگر ان لوگوں کا سوچو جو اچانک اس نامراد وائرس کا شکار ہو کر اپنوں سے جدا ہو گئے۔ بیرونِ ملک میں تو مردوں کو دفنانے کے لیے قبریں کم پڑ گئی ہیں۔ کئی جگہ تو لاشوں کو سمندر میں پھینکا جا رہا ہے۔ میرا غم تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ مجھ سے زیادہ دعاؤں کی ان لوگوں کو ضرورت ہے۔ چلو مل کر ان سب کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔‘ اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

میں حیرت سے اس کا افسردہ چہرہ دیکھتی رہی۔ چہرے پر چھائی اداسی اور درد کے بادل صرف باپ کو کھونے کے نہیں تھے بلکہ ان ہزاروں لوگوں کے مرنے کے لیے تھے جو صرف اس شہر اس ملک ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں مر رہے تھے۔ کسی بھی شخص کو اس کے چہرے اس کے لباس یا اس کے لب و لہجے سے کیسے جانچا جا سکتا ہے؟ انسان تو پرت در پرت خود سے چھپا رہتا ہے۔ اس کی اس بات نے میرے دل میں چھپی کدورت ختم کر دی۔ میں صرف ایک بیٹی کے دکھ سے دکھی تھی اور وہ دنیا کے غم سے پریشان۔ موت کا یہ سایہ دھیرے دھیرے اپنے پنکھ پھیلا رہا ہے۔ نہ جانے کب یہ سلسلہ تھمے گا؟ نہ جانے ختم ہونے سے پہلے کتنی جانوں کی قربانی لے گا؟ نہ جانے کل کیا صورت حال ہوگی؟ نہ جانے کتنے اپنوں کا ساتھ چھوٹ جائے گا؟ یا شاید یہ سب دیکھنے کو ہم بھی بچے یا نہ بچے؟ اللہ ہی جانتا ہے۔

□□□

Dr. Renu Behl
1505, Sector 49B
Chandigarh-160047 (Haryana)

زندگی کا پیکیج

ڈاکٹر شبنم رضوی

آج کل جب امتحان کی شروعات ہوتی ہے- دن ایسا بھاگتا ہوا نظر آتا ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ آج کا دن بھی ایسا ہی تھا۔ ہندی اور سوشولجی کا پیپر ہو تو ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے کیونکہ سب سے زیادہ لڑکیاں اسی مضمون کی ہوتی ہیں۔ آج یہی پیپر تھا۔ انوجلیشن (Invigilation) ڈیوٹی میں بھی دوسرے کالج کی ٹیچرس کو بلایا جاتا ہے۔

اس دوران ایک ٹیچر کالج کی اور ایک دوسرے کالج کی ڈیوٹی ایک کمرے میں لگائی جاتی ہے۔ اس طرح روز روز نئی نئی ٹیچر سے ملنے اور ملاقات کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جیسے ہی سات بجے کا گھنٹہ بجا ساری ٹیچرس اسٹاف روم میں جمع ہوگئیں۔ کمرہ نمبر بولا جانے لگا اور ساتھ ہی دو دو ٹیچرس کا نام بھی۔ میرے ساتھ کسی ڈاکٹر حنا کا نام پکارا گیا مگر وہ تب تک نہیں آئیں تھیں۔ میں پیپر کا پیکیٹ اور کاپی لے کر کمرہ نمبر 12 میں پہنچ گئی۔

میں نے آنے والی لڑکیوں کی چیکنگ کی، رول نمبر وائز انھیں بٹھایا۔ پیپر اور کاپی بھی بانٹ دی مگر ڈاکٹر حنا تب تک نہیں آئیں۔ جب کاپی پر سائن کرنے لگی تب ڈاکٹر حنا دوڑتی بھاگتی آئیں۔ میں انھیں دیکھ کر بڑی مایوس ہوئی۔

گرمی میں سینتھیٹک کپڑے میں ملبوس، اُڑے اُڑے کھچڑی بال پرانا پرس جگہ جگہ سے اُدھڑا ہوا، بڑی چپل، گندے ناخون، لبڑ دھبڑ کرتیں کمرے میں داخل ہوئیں۔ مجھے انھیں دیکھتے ہی الجھن ہونے لگی۔ بہر حال میں نے سلام کا جواب دیا اور بچی ہوئیں لڑکیوں کی کاپی پر سائن کرنے کو کہہ کر میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

حنا بہت انہماک کے ساتھ کام کرنے لگیں۔

وہ ایک ایک لڑکی کے پاس جاتیں- اس کا 'پرویش پتر' چیک کرتیں، رول نمبر ملاتیں، فوٹو چہرے سے ملاتیں اور پھر سائن کرتیں کاپی پر پھر لڑکی کا سائن کرواتیں۔ بہت اطمینان سے کام کرتا دیکھ میرا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔

''یہ پیپر اسٹاف روم میں دے آؤں'' حنا نے پوچھا۔

میں نے 'ہاں' میں سر ہلا دیا۔ وہ چلی گئیں۔

اور جب واپس آئیں تو فرج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل بھی لے آئیں۔ ٹھنڈا پانی دیکھ کر جی خوش ہوگیا اور چند لمحے بعد ہی ہم اور حنا دوست بن گئے۔

حنا نے بتایا کہ وہ دس سال سے پڑھا رہی ہیں ابھی تک پرمانینٹ نہیں ہوئیں۔ اسی اسکول میں بچی بھی پڑھتی ہے۔ میں آگے بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر حنا تو استاد نکلی بات کرنے میں۔

پھُس پھُس بات کرتے کرتے اس نے آخر اپنی پوری رام کہانی سنا ہی دی۔ بہت جلدی مجھے معلوم ہوگیا کہ ڈاکٹر حنا ''تین طلاق'' کی ماری ہیں۔ اس کے شوہر نے رمضان کے دنوں میں افطاری کے وقت سرِ شام طلاق-طلاق-طلاق کہہ کے گھر سے نکال دیا تھا۔

مجھے یقین ہی نہیں ہوا......

''نہیں بھئی ایک مسلمان رمضان کے مہینے میں روزہ رکھے ہوئے ایک روزے دار بیوی کو طلاق کیسے دے سکتا ہے۔''

''مگر اس نے مجھے دیا'' حنا آنکھوں میں آنسو بھر کے بولی۔

''یہ تو سراسر غلط ہے؟......

ہاں......مگر یہ سچ ہے......

مگر کیوں بھئی...... مجھے اس کے شوہر پر شدید غصہ آنے لگا۔

''افطاری کے وقت شربت کی مٹھاس کم تھی......''

''ارے یہ کوئی بات ہے؟......

ہاں میم ہمارے یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے......

''بات بات پر طلاق دی جاتی ہے''......وہ خاموش کسی خیال میں کھوتی گئی۔

حنا کی باتیں اتنی دلچسپ اور دل دکھانے والی تھیں کہ میں چند منٹ کے لیے کلاس سے باہر نکل آئی تا کہ اس کی روداد سن سکوں......حنا بتا رہی تھی......میم شام کا وقت تھا ابھی اذان شروع ہی ہوئی تھی کہ میں نے افطاری لگا کے وضو کیا اور نماز مغرب کے لیے کھڑی ہوئی کہ شوہر کی آوازیں آنے لگیں......

''میں نے نماز ختم کی تو دیکھا بیٹی کمرے کے کونے میں کھڑی رو رہی ہے۔اس نے شکایت کی...... پاپا نے مارا''

میں نے شوہر کی طرف دیکھا - یہ پوچھنے کے لیے کہ کیوں مارا۔مگر اس کا غصے سے طم طمایا چہرا دیکھ کر ہمت نہ پڑی......میں نے بیٹی کو چمٹا لیا۔ وہ ڈر رہی تھی -شوہر غصے تھے...... لنگی پہنے، ٹوپی لگائے، لمبی داڑھی، ماتھے پر نماز کا نشان، ہاتھ میں تسبیح، ماتھے پر شکن اور زبان پر طلاق۔

انھوں نے شربت اٹھایا اور میرے منھ پر پھینک دیا...... میں ترچھی ہو گئی ورنہ گلاس میرے منھ کو زخمی کر دیتا۔

''یہ شربت بنایا ہے...... پھیکا......گرم...... دن بھر دکان پر رہنے کے بعد گھر آؤ تو یہ ملتا ہے۔اس نے دسترخوان کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دسترخوان کی طرف دیکھا۔ کھجور، ٹھنڈا پانی، شربت، پکوڑی، کباب، چنے کی گھنگنی، اُبلا انڈا، پوری، سوجی کا حلوہ سبھی کچھ تو تھا۔مگر اس نے طلاق طلاق طلاق کہہ کر گھر سے نکال دیا۔ میں تو روزہ بھی نہیں کھول پائی تھی۔اس نے لڑکی سمیت مجھے گھر سے نکال دیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ اس وقت دل یہی چاہ رہا تھا 'سیتا میا' کی طرح زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔عورت کی اتنی توہین...... میں گھنٹوں سڑک کے کنارے نل کے پانی سے روزہ کھول کے وہیں بیٹھی روتی رہی۔

''ہم اور حنا سب غم و غصّہ بھول کے کاپی جمع کرنے گئے۔ پھر کاپی جمع کرانے میں کافی وقت لگ گیا پھر کبھی حنا کی ڈیوٹی ہمارے ساتھ نہیں لگی...... زمانہ گزرتا گیا...... روزمرّہ کے کام کاج، دوڑ دھوپ میں کہاں حنا یاد رہنے والی تھی...... وہ تو میرے ذہن سے ہی نکل گئی تھی۔ میں جونیئر ٹیچر سے اسسٹنٹ پروفیسر اور ایسوسیٹ پروفیسر بن گئی۔ کالج میں تبدیلی آگئی۔ میرا شاندار کالج فتحانہ انداز میں کھڑا ترقی کی داستان سنا رہا ہے۔ میں بلکہ ہم سب ٹیمپو کی جگہ گاڑی سے کالج آتے ہیں۔ رتبہ، عہدہ سب بلند ہوتا گیا''

شام ڈھلے جب میں گھر پہنچی تو والدین کا رو رو کے برا حال ہو گیا۔ بھائی مرنے مارنے کو تیار......مگر ہوا کچھ نہیں والدین بیٹی کی بدقسمتی کا رونا رونے لگے۔ چند دنوں بعد ہی بھائی بھاوج کا نظریہ بدلنے لگا۔ میں معصوم بہن سے مکار نند بن گئی۔ میرے گھر میں جگہ کی کمی ہو گئی۔ بھائی بھاوج بھی کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ نہ جانے میم زندگی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ حنا نے ٹھنڈی سانس لی...... اب نوکری کرتی ہوں پانچ ہزار ملتا ہے......اسی میں گزارا کرتی ہوں۔ اپنا اور بیٹی کا...... حنا خاموش ہو گئی۔ گہری اداسی اس کے چہرے پر چھا گئی بالکل بدلی کی طرح......اور آنکھوں سے آنسو کی بارش ہونے لگی......تبھی امتحان ختم ہونے کا گھنٹا بجا۔

ہم اور حنا سب غم و غصہ بھول کے کاپی جمع کرنے گئے۔ پھر کاپی جمع کرانے میں کافی وقت لگ گیا پھر کبھی حنا کی ڈیوٹی ہمارے ساتھ نہیں لگی...... زمانہ گزرتا گیا......روزمرّہ کے کام کاج، دوڑ دھوپ میں کہاں حنا یاد رہنے والی تھی......وہ تو میرے ذہن سے ہی نکل گئی تھی۔ میں جونیئر ٹیچر سے اسسٹنٹ پروفیسر اور ایسوسیٹ پروفیسر بن گئی۔ کالج میں تبدیلی آ گئی۔ میرا شاندار کالج فاتحانہ انداز میں کھڑا ترقی کی داستان سنا رہا ہے۔ میں بلکہ ہم سب ٹیمپو کی جگہ گاڑی سے کالج آتے ہیں۔ رتبہ، عہدہ سب بلند ہوتا گیا۔

آج دس برس کا زمانہ گزر گیا مگر آج بھی ہمارے کالج میں امتحان

کے دوران جب جب بڑا پیپر ہوتا ہے تو دوسرے کالجوں سے ٹیچرس کو بلایا جاتا ہے۔

آج پھر سوشولجی کا بڑا پیپر تھا۔ دوسرے کالجز سے کئی ٹیچرس کو بلایا گیا تھا......

گھنٹا بجتے ہی ٹیچرس کے نام اور کمرہ نمبر بتایا جانے لگا۔ میری ڈیوٹی کمرہ نمبر 14 میں تھی کسی ڈاکٹر حنا کے ساتھ۔ جیسے ہی ہمارا نام بولا گیا۔ حنا نے لپک کے کاپی کا بنڈل اور پیپر تھام لیا اور کمرہ نمبر 14 کی طرف چل پڑی۔ چند لمحے بعد میں بھی چلی گئی۔ دیکھا......ایک اسمارٹ سی ٹیچر لڑکیوں کی چیکنگ کر کے ان کی سیٹ پر بٹھا رہی ہیں۔ میری نظر اس کی اسمارٹ نیس دیکھنے لگی۔ اچھی لگ رہی تھی ٹیچر......میں نے دل میں سوچا!

ہیل کی چپل، تراشے ہوئے مناسب بال، مینی کیور، پیڈی کیور کیے ہوئے چمچاتے ہاتھ پیر، اوہ 'ہش پپی' کی چپل۔ یہ تو بڑی مہنگی ہوتی ہے؟

دل نے کہا......شفون کی مناسب ساڑی، گوچی کا بہترین پرس، واہ میرا جی خوش ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھ ٹھنڈے پانی کی بڑی بوتل بھی لائی تھی۔

کلاس میں کاپی پیپر بانٹنے کے بعد سائن کیا تب تک چائے آ گئی ہم دونوں چائے پینے لگے۔ اس نے مسٹر براؤن کا بسکٹ کا پیکٹ نکالا اور ہماری طرف بڑھایا......

میں کافی دیر سے یہ سوچ رہی تھی کہ اس کو کہاں دیکھا ہے۔ لگاتار دماغ یادوں کا در کھٹ کھٹا رہا تھا مگر کچھ یاد نہیں آیا......

''لیجیے میم'' حنا کے خوبصورت ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی چمکی۔

لیجیے میم۔ پلیز......اس نے اصرار کیا۔

حنا نے چہک کے کہا......میم آپ نے آج کا اخبار پڑھا......

نہیں......صبح صبح تو یہاں آنا پڑتا ہے۔ صبح کو نہیں میں دوپہر کو اخبار پڑھتی ہوں......

ہاں......میم......وقت تو نہیں ملتا مگر آج کی نیوز تو زبردست ہے۔

''آج تین طلاق کے خلاف بل پاس ہو گیا''......وہ بہت خوش ہو رہی تھی۔ ہم دونوں بات کرتے کرتے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ میں یاد کر رہی تھی کہ حنا کو کہاں دیکھا ہے......مگر یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔ حنا نے چہک کے کہا......اچھا ہے نہ طلاق بل۔ کم سے کم اب بات بات میں مرد عورت کو طلاق نہیں دے پائیں گے......جیسے مجھے دیا......

اوہ!......میرا ذہن دوڑا......یہ وہی حنا ہے۔ ڈاکٹر حنا......کافی سال پہلے جس اجڑے چمن کے ساتھ ڈیوٹی لگی تھی۔ آج شاداب باغ و بہار، گلشن بے خار، گلشن گلزار بن گئی تھی۔ میں نے پہچانتے ہوئے اس کے شگفتہ چہرے کی طرف دیکھا۔ آج وہ مجھے ''مطمئن خوش اور خوبصورت لگ رہی تھی۔

''بہت خوش ہو ڈاکٹر حنا میں نے پہچانتے ہوئے نئے لہجے میں کہا......''

''تو آپ نے آخر پہچان ہی لیا ہے۔ وہ مسکرائی۔

میں بھی مسکرا دی......

کافی بدل گئی ہوں نہ اسی وجہ سے پہچاننے میں دقت ہوئی۔

ہاں......یہ تو ہے......مگر زندگی بھی تو بدل گئی......نا۔ میں تو وہی ہوں......پر بیٹی بڑی آدمی بن گئی ہے۔ بڑے عہدے پر کام کرتی ہے دبئی ایئرپوٹ پر......اس نے ایک لمبی سانس لی جی جان لگا دیا بٹیا کو پڑھانے میں۔ آج اس کو خوش دیکھتی ہوں تو اپنا غم بھول جاتی ہوں۔

اچھی سیلری پاتی ہے......جانتی ہیں جتنا روپیہ مجھے اسکول سے تنخواہ ملتی تھی اتنا تو وہ اپنی نوکرانی کو دیتی ہے۔ پانچ ہزار روپیہ۔ ڈاکٹر حنا نے پانچ ہزار کو اتنا کھینچ کر کہا کہ ہمیں پچاس ہزار لگنے لگے اور ذرا سوچئے ڈاکٹر ایز پانچ ہزار روپیہ میں میں نے اسے پالا تھا۔ تبھی بیل بج گئی......

ہم دونوں کاپی لینے کے لیے اٹھ گئے اور میرا دماغ ڈاکٹر حنا کی پچھلی زندگی کی طرف چلا گیا۔

□□□

Dr. Shabnam Rizvi
Head Dept, of Urdu
Karamat Husain Muslim Girls PG College
Nishat Ganj, Lucknow226001 (U.P)

رخسانہ نازنین

تحفہ

اٹلی جیسے ترقی یافتہ ملک کے میلان جیسے شہر میں رہنے والی کرسٹینا اپنی ذات وصفات میں حسین، خوش مزاج اور امور کے لحاظ سے خانہ داری کی مصروف خاتون تھی اس کا گھر آباد اور زندگی شاد تھی!

اس کی پرسکون زندگی میں ہلچل اس وقت مچ گئی جب وہ برسوں بعد وطن لوٹی اپنی دوست امیلیا کو لینے ائیر پورٹ چلی گئی۔ امیلیا امریکہ سے لوٹی تھی۔ جہاں وہ اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھی۔ امیلیا اور کرسٹینا بچپن کی دوست تھیں،۔ پہلے وہ اٹلی کے ایک گاؤں میں ساتھ رہتی تھی۔ دونوں کے خاندان ایک دوسرے کے لیے اچھے پڑوسی تھے اور کرسٹینا امیلیا، گھر، گلی محلہ، پڑھائی لکھائی کھیل کود سب میں ایک ساتھ ہی رہتی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ امیلیا کے والدین نے ترقی کے لیے اعلیٰ تعلیم وتربیت اور بڑے شہر کو چنا اور آگے چل کر وہ کاروبار کے سلسلے میں امریکہ منتقل ہو گئے تھے۔ کرسٹینا بھی گاؤں سے میلان آچکی تھی اس نے یہاں آکر پڑھائی پوری کی اور اپنے کالج ہی کے برطانوی نژاد دوست ڈیوڈ کے ساتھ زندگی گزارنے کا محبت بھرا فیصلہ بھی کیا جو حسین ترین ثابت ہوا دو خوبصورت بچے اور پرتعیش زندگی سب کچھ تھا مگر مصروفیات کے بہاؤ میں کہیں کچھ پل کی فرصت مل جاتی تو وہ گزرے ہوئے دنوں کی یادوں میں گم ہو جاتی تھی۔ وقت اور حالات کے سبب رشتوں اور دوستوں میں دوریاں تو ہو سکتی ہیں مگر انہیں ختم نہیں کیا جا سکتا۔ کرسٹینا اور امیلیا بھی ایک طویل عرصے بعد دور رہ کر بھی سوشل میڈیا کے توسط سے قریب آ ہی گئیں دونوں نے ایک دوسرے کی متعلقہ پوسٹس کو ہی نہیں ایک دوسرے کو بھی پہچان لیا اور پھر سوشل میڈیا پر بھی بچپن ہی کی طرح روز وشب کی ساتھی بن گئیں۔۔۔۔

امیلیا کی آمد کی خبر پا کر وہ فرط مسرت سے جھوم اٹھی تھی۔ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے کے کئی پروگرام ترتیب دے ڈالے تھے۔ ڈیوڈ کے ساتھ ساتھ بچے بھی اس کی بے تابی پر اسے چھیڑ رہے تھے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ائیر پورٹ جانے والے تھے مگر اتفاق سے اسی دن ڈیوڈ کو ایک بزنس میٹنگ اٹینڈ کرنے کے لیے وینس جانا پڑا۔ ڈینیل اور اینجلینا اپنے دوستوں کے ساتھ ویٹیکن سٹی چلے گئے تھے۔ ان کا یہ پروگرام پہلے سے طے تھا۔ لہذا اسے تنہا ائیر پورٹ جانا پڑا۔

ائیر پورٹ پہنچ کر اس نے امیلیا کا گرم جوشی سے استقبال کیا برسوں بعد ہونے والی اس ملاقات کی خوشی دیدنی تھی۔ ایمیلیا کی مسکراہٹ، کرسٹینا کے چہرے کی چمک ان جذباتی لمحات کا حاصل تھی۔۔

سرد ملکوں کے موسم کا طبعی اثر، ایک لمبے سفر کی تھکاوٹ اور مزاج کا بوجھل پن نرم و نازک امیلیا کے چہرے سے نمایاں تھا مگر کرسٹینا سے روبرو ہونے کی مسرت اس کیفیت پر حاوی تھی۔ امیلیا نے اپنے مزاج کے مطابق قیام کے لیے گھر کی بجائے ہوٹل کو ترجیح دی تھی حالانکہ کرسٹینا نے اسے اپنے گھر لے جانا چاہا مگر وہ نہ مانی کیوں کہ پرائیویسی کے تحت وہ پہلے ہی قریب کے ہوٹل میں ایک روم بک کر چکی تھی۔ ائیر پورٹ سے ہوٹل پہنچ کر کچھ دیر دونوں ساتھ رہیں۔ پھر آئندہ دنوں کے پروگرام طے کر کے کرسٹینا اپنے فلیٹ واپس لوٹ آئی۔ ڈیوڈ اور بچے گھر پر نہ تھے۔ اس نے امیلیا کے ساتھ ہی ہلکی سی ڈرنک لی تھی۔ اب بھوک محسوس کر رہی تھی مگر کھانا بنانے کو دل نہ چاہا۔ اسے سر میں درد اور تھکان محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یونہی بستر پر دراز ہو گئی اور نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔

صبح ڈور بیل کے ساتھ ہی زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ پولیس کی ایک پوری ٹیم ڈاکٹرز کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ ان سب کو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس سے قبل کہ کچھ پوچھتی۔ لیڈی پولیس انسپکٹر نے نرس کو اشارہ کیا۔ وہ سب حفاظتی لباس میں تھے اور ماسک لگائے ہوئے تھے۔ انھوں نے کرسٹینا کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور ایمبولینس میں بٹھا دیا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ فلیٹ کو سیل کر دیا گیا اور ایمبولینس ہاسپٹل کی طرف چل پڑی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟" وہ چیختی چلاتی رہی۔۔۔

"چپ رہو۔ زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں! ایئرپورٹ کے سی سی ٹی وی کیمرے کی مدد سے تمھاری شناخت کی گئی ہے۔ تم امریکہ سے آئی ہوئی جس خاتون سے بغل گیر ہوئی تھیں وہ رات ہوٹل کے کمرے میں مردہ پائی گئی ہے۔ شبہ ہے کہ وہ کورونا وائرس سے متاثر تھی۔ اس کے فون میں تمھاری تصویر کے ساتھ نمبر ملا اور لوکیشن کا پتہ چلا۔ اسی لیے تمھیں بھی حراست میں لے کر ہاسپٹل شفٹ کیا جا رہا ہے۔ تمھاری بھی مکمل جانچ ہوگی۔ تمھارے گھر کو بھی مقفل کر دیا گیا ہے تاکہ تم نے جن اشیا کو چھوا تھا اس سے وائرس دوسروں میں منتقل نہ ہو جائے!"۔ لیڈی پولس اور نرس نہایت سختی سے پیش آ رہے تھے۔

یہ سن کر کرسٹینا کے حواس گم ہو گئے۔ اس نے منت سماجت کر کے ڈیوڈ کو فون کروایا۔ وہ یہ سارا ماجرہ سن کر گھبرا گیا۔ پہلی فلائٹ سے میلان لوٹا مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔

کرسٹینا کے ٹیسٹ پازیٹیو آئے تھے۔! اور امیلیا کی لاش نہایت احتیاط کے ساتھ ہاسپٹل کے مردہ خانے میں محفوظ کر دی گئی تھی۔۔

نیوز میں کرونا وائرس کے پھیلنے کی خبریں عام تھیں، اس اثنا میں پورے اٹلی میں کئی کیسیز سامنے آئے تھے پورے ملک میں دہشت پھیل گئی تھی۔ انسانوں کو انسانوں سے دور رکھے جانے کی تدابیر تو جاری ہی تھیں مگر اب تمام تر حفاظتی اقدامات مزید سخت ہوتے جا رہے تھے۔

یوں تو چین میں اس وائرس نے تباہی مچا رکھی تھی۔ اور دنیا بھر کے سپر پاورس اس کے سامنے گھٹنے ٹیک چکے تھے مگر ان سب سے بے خبر اور اپنی زندگی میں مست رہنے والی کرسٹینا کو ذرا سی کوتاہی کا بڑا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اسے قطعی علم نہ تھا کہ امیلیا بھی امریکہ میں رہتے ہوئے اس چینی وبا کی شکار ہو چکی تھی ورنہ وہ اسے ریسیو کرنے نہ جاتی۔ مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے کہ وہ بھی کورونا وائرس کی شکار ہو ہی گئی۔!

سب کچھ اچانک اور غیر متوقع تھا۔ کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ اسے زندگی میں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کی نگہداشت پر مامور لوگ بھی اس سے یوں بچنے لگے تھے مانو وہ کوئی بلائے آسمانی ہو۔ معاشرے کی بے گانگی اپنی جگہ مگر شریک زندگی نے بھی عہد شکنی ہی کی تھی۔ سنگ جینے مرنے کے سارے وعدے توڑ دیے تھے۔! بچوں نے منہ موڑ لیا تھا۔!

وہ ہاسپٹل کے ایک اسپیشل وارڈ میں محصور کر دی گئی۔ ڈاکٹرس اور نرس ماسک لگا کر آتے، چیک اپ کرتے اور لوٹ جاتے۔ شدید تکلیف اور تنہائی کا جان لیوا احساس اسے موت سے پہلے ہی مار چکا تھا۔

موت تو جب آنی ہے تب آئے گی مگر وہ لمحہ لمحہ مر رہی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ آس پاس پھیلے مہیب سناٹے دل کی تاریکی اور بڑھا دیتے تھے۔ اپنوں کو تلاش کرتی نگاہیں مایوس ہو جاتی تھیں۔ کسی کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ سب کو بس اپنی جان پیاری تھی۔ کوئی اس کے قریب نہ آتا تھا۔! کیا قصور تھا اس کا؟ بس یہی کہ اس نے دوستی نبھائی تھی؟

بیماری اور قید تنہائی۔۔۔ نہ کوئی اس سے مل سکتا تھا نہ وہ کسی کو اپنا حال دل سنا سکتی تھی۔ ڈاکٹرز کا رویہ بھی بے مہر ہوا کرتا۔ وہ اپنے پیشے کے تئیں مجبوراً اپنا فرض نبھا رہے تھے۔ اس کی آہیں، وارڈ کے در و دیوار سے ٹکرا کر لوٹ آتیں۔ اپنی خوشگوار زندگی کے ماہ و سال کی خوبصورت یادوں کی پناہ میں کچھ پل سکون ملتا۔ پھر سانس کی تکلیف کے ساتھ ڈیوڈ اور بچوں سے جدائی کے غم میں تڑپنے لگتی۔

اسی عالم بے بسی میں دن گزرتے رہے۔ موت کا خوف اور تنہائی کی اذیت۔ ایک ہفتے کے اس طویل دورانیے میں گاہے گاہے اس کی سانس اور سسکیاں بلند ہو جاتیں اور پھر اس کی حالت یوں تشویش ناک ہوئی کہ وینٹی لیٹر کے سہارے کے باوجود اس کے کمزور جسم نے مزید سانس لینے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹرز نے ڈیتھ رپورٹ بنا کر کرسٹینا کی لاش کو بھی سخت بندوبست کے ساتھ مردہ گھر بھیج دیا جہاں پہلے سے کئی تابوت موجود تھے ان میں سے ایک امیلیا کا تابوت بھی تھا جس نے برسوں بعد مل کر نادانستہ طور پر اپنی بچپن کی دوست کرسٹینا کو موت کا تحفہ دے دیا تھا۔!

Rukhsana Nazneen
H. No. 4-2-22
Noor Khan Taleem
Bedar-585401 (Karnatka)

درخشاں پروین

بیٹی

''مبارک ہو بیٹی ہوئی ہے''۔ نرس کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ خالد کو محسوس ہوا جیسے اسے کسی نے بہت اونچائی سے اٹھا کر زمین پر پھینک دیا ہو۔ وہ نرس کو جاتا ہوا دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔ یہ کیا ہوا؟ یہ تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ بیٹی ہوگی۔ گھر میں امی کی باتوں میں جب اس نے یہ سنا کہ'' آثار تو لڑکے کے ہیں''، تو اسے یقین ہوگیا تھا کہ اس کے گھر بیٹا ہی ہوگا۔ یوں بھی اسے بیٹیوں سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس زمانے میں لڑکیاں لڑکوں سے تعلیم میں آگے ہیں اور پڑھ لکھ کر اچھے عہدوں پر بھی جارہی ہیں۔ اس کے باوجود ان کی پرورش اور حفاظت ایک مسئلہ ہے۔ ان کی تعلیم پر ہزاروں روپیہ خرچ کرنے کے بعد ایک دن انھیں پرائے گھر جانا ہے۔ وہ لڑکوں کی طرح ماں باپ کا سہارا ثابت نہیں ہوتیں۔ تعلیم کے بعد شادی کے لیے جہیز کا انتظام اور ڈھیر سارا جہیز دینے کے بعد بھی اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ اس کے سسرال میں اس پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ لڑکی والوں کو ہمیشہ اس کے سسرال والوں کے سامنے دب کر ہی رہنا پڑتا ہے۔

خالد بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا اور جب اسے بتایا گیا کہ اس کی بیوی کو کمرے میں شفٹ کردیا گیا تو وہ بوجھل قدموں سے اس طرف گیا۔ اس کی بیوی سارہ کے پہلو میں ایک ننھی سی بچی لیٹی ہوئی تھی۔ سارہ کے چہرہ پرسکون تھا مگر اس کی آنکھیں خالد کے چہرے پر اس کے تاثرات ٹٹول رہی تھیں۔ خالد کی ماں نے اسے مبارک باد دی اور اور پھر باتوں باتوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی جو خدا کی مرضی ہے، اسے ہمیں قبول کرنا چاہیے۔ ''بیٹیاں تو گھر کی برکت ہوتی ہیں۔'' خالد نے اس پر واضح طور پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ بچی کا نام رکھنے کی باری آئی تو خالد نے اس میں بھی کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ آخر اس کی والدہ نے اپنی پوتی کا نام راحیلہ رکھا۔

راحیلہ کی پیدائش کے بعد خالد کا رویہ آہستہ آہستہ ظاہر ہونے لگا۔ بچی اس کی گود میں ہوتب بھی اس کی شفقت کو ترستی ہی رہتی تھی۔ روزگار کی تلخیوں نے گھر میں خاموشی کو احتجاج کی شکل دے دی تھی۔ خالد کی والدہ اس کے اور اپنی بہو کے درمیان ایک مضبوط پل کی طرح تھی مگر وہ بھی ہزار کوششوں کے باوجود خالد کے دل میں بچی کے لیے نرم گوشہ پیدا نہ کرپائی۔ دو سال بعد خالد کی والدہ کو دل کا دورہ پڑا اور وہ چل بسیں۔ اس کے بعد خالد اور اس کی بیوی کے درمیان دن بہ دن تلخیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ خالد شاید بیوی اور بچی سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا اس لیے اس نے اس الجھی ڈور کو سلجھانے کی کوشش نہیں کی۔ روز روز کے جھگڑوں نے دونوں کا ساتھ رہنا مشکل کردیا اور آخر وہ گھر طلاق کے سبب پوری طرح بکھر گیا۔ خالد کی بیوی اپنے میکے چلی آئی اور خالد روزگار کی تلاش میں اپنا گھر فروخت کرکے دہلی چلا گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ سارہ کے گھر والے آسودہ حال تھے انھوں نے اسے سہارا دیا اور وہ اپنے میکے میں رہنے لگی۔ اس کے بھائی اسے بہت چاہتے تھے، ان کے ہاں نہ اس کے رہنے کا کوئی مسئلہ تھا اور نہ خرچ کے لیے روپے کی کمی۔ راحیلہ بہت ذہین اور محنتی تھی۔ ماموں اور نانا کی محبت نے

اسے کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا مگر اس کی آنکھیں اپنے والد کو دیکھنے کو ترستی ہی رہیں۔ وہ اکثر اپنی ماں سے اپنے والد کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ اس خلاء نے اسے اپنی زندگی کو سنوارنے کی ایک عجیب سی دھن اس کے اندر پیدا کر دی۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ اسے زندگی میں کچھ کر دکھانا ہے۔ اپنی تعلیم کے ہر مرحلے میں وہ کامیابیاں حاصل کرتی چلی گئی۔ آخر ایک وقت آیا کہ ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس نے اسی شہر میں اپنا کلینک کھول لیا۔ خدا نے راحیلہ کے ہاتھ میں شفا رکھی تھی، اس کی پرکٹس چل نکلی اور اس کا شمار شہر کے مشہور ڈاکٹروں میں ہونے لگا۔

ایک دن اس کے کلینک میں ایک بوڑھا آدمی داخل کیا گیا۔ اس کے بارے میں کسی نے بتایا کہ وہ کسی کام سے اس شہر میں آیا تھا اور راستے سے گزرتے ہوئے کسی موٹر سائیکل سوار نے اسے ٹکر مار کر بری طرح زخمی کر دیا۔ ایک ہفتے تک اس کا علاج چلتا رہا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ بوڑھے کو جب ہوش آیا اور اسے پتہ چلا کہ اس کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا ہے تو بہت زیادہ پریشان ہوگیا۔ اس سے جب نرس نے پوچھا کہ اس شہر میں اس کا کوئی شناسا ہے تو خاموش ہوگیا اور دیر تک خلا میں گھورتا رہا۔ دوسرے دن اس نے بتایا کہ یہاں اس کا کوئی نہیں ہے۔ وہ کسی کام سے ایک دن کے لیے یہاں آیا تھا اور یہ حادثہ پیش آیا۔

''کیا آپ یہاں کسی کو جانتے ہیں؟''

''نہیں، میں کسی کو نہیں جانتا۔'' اس کی آواز خلافِ معمول بہت تیز تھی اور اس کے چہرے پر عجیب سا دباؤ تھا۔

اگلے دن اس نے بتایا کہ دہلی میں اس کی بیوی رہتی ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اسے فون سے اطلاع دی گئی۔ راحیلہ نے اس بوڑھے کو دیکھا تو اسے لگا جیسے وہ اسے جانتی ہے مگر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے اس بوڑھے کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اس نے نرمی سے اس سے بات کی۔ اس بوڑھے نے بتایا کہ اس شہر میں کوئی ایسا نہیں جو اس کے لیے وہاں آئے۔ راحیلہ کی ہدایت پر اس کا خاص خیال رکھا گیا۔ بوڑھا اس کے اس سلوک سے بہت متاثر تھا۔ جلد ہی اس کی بیوی وہاں آگئی۔ اس سے اسے اطمینان ہوا۔ اسے اس ہاسپٹل میں ایک ہفتے سے زیادہ وقت ہوگیا تھا اور اب پلاسٹر لگانے کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تھا۔ اس کی بیوی نے اسے دہلی لے جانے کا انتظام کرلیا تھا۔

جس دن وہ ہاسپٹل سے رخصت ہونے لگا باہر آتے ہوئے اس کی نظر ڈاکٹر کے نام پر پڑی۔ ''ڈاکٹر راحیلہ! یہ کون ہے؟''

''میں ہی ہوں،'' وہیں کھڑی راحیلہ نے جواب دیا۔

''تم کس کی بیٹی ہو ؟ تمہاری والدہ کا کیا نام ہے ؟'' بوڑھے نے پوچھنا شروع کیا اور کئی باتیں معلوم کرنے کے بعدا چانک ایسا لگا جیسے وہ وہیں گر جائے گا اسے وہیں رکھی ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا اب وہ راحیلہ کو غور سے دیکھ رہا تھا .اس کی آنکھیں جیسے اس کے چہرے پر جم گئی تھیں اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے .

''تم کس کی بیٹی ہو؟ تمہاری والدہ کا کیا نام ہے؟'' بوڑھے نے پوچھنا شروع کیا اور کئی باتیں معلوم کرنے کے بعد اچانک ایسا لگا جیسے وہ وہیں گر جائے گا اسے وہیں رکھی ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اب وہ راحیلہ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے اس کے چہرے پر جم گئی تھیں اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''چلئے! گاڑی آگئی ہے۔'' بیوی کی آواز کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایسا لگا جیسے اس کا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ بہت دیر تک وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو بیوی نے جھنجھلا کر اسے جھنجھوڑا اور تیز آواز میں اسے وہاں سے اٹھنے کے لیے کہا۔ اب تو اسے اٹھنا ہی تھا مگر لگتا تھا وہ وہاں سے جانا نہیں چاہتا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ کار میں سوار ہوگیا تب بھی راحیلہ کو دیکھتا رہا، اس کے چہرے پر آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ راحیلہ کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس سے پہلے بھی بے شمار مریض یہاں سے جاتے ہی رہے مگر آج اس کا دل اس کے قابو میں کیوں نہیں۔ راحیلہ کو نرس کا جملہ سنائی دیا۔

''میڈم کی مہربانی سے باباجی بہت ہی متاثر ہوگئے۔''

کار اسپتال کے احاطے سے باہر جاچکی تھی۔

□□□

Darkashan Parveen
Research Scholar
Begum Azeezun Nisa Hostel
Room No. 160
Near Gulistane Sir Syed
Aligarh-202002 (U.P)

غزلیں

شہناز فاطمہ صدیقی

اب دعاؤں میں کچھ تو بہتر مانگ
پیاس کے واسطے سمندر مانگ

جس کی ٹھوکر سے دل بدلتے ہوں
ایسا بھی اک خدا سے پتھر مانگ

نفرتوں کو ملے نہ کوئی جگہ
یوں محبت کے سارے منظر مانگ

پاؤں جس سے کبھی نہ ہوں باہر
اب کے ایسی خدا سے چادر مانگ

ہے بہت سخت زندگی کا سفر
ہم سفر مانگ کوئی رہبر مانگ

کس قدر خالی پن ہے بکھرا یہاں
دل کی خاطر بھی کوئی دلبر مانگ

بن ترے خوشگوار کچھ بھی نہیں
پھول، خوشبو، بہار کچھ بھی نہیں

اک محبت کا لمس ہے کاری
تیغ، خنجر کا وار کچھ بھی نہیں

منزلوں کی خبر ہے ہم کو مگر
راستوں کا شمار کچھ بھی نہیں

کچھ دنوں سے عجیب حالت ہے
بے قراری ، قرار کچھ بھی نہیں!

Shahnaz Fatima Siddiqui
H. No. 293/57-D
Old Haider Ganj
Lucknow-226003 (UP)

لذیذپکوان

گول گپے

اجزا: میدہ 1 کپ، تیل 1 کھانے کا چمچ، تیل فار فرائنگ، فلنگ کے لیے، آلو 1 کپ (بوائلڈ)، کابلی چنے 1 کپ (بوائلڈ) (سفید والے)، املی 50 گرام، چینی 1 کپ، لیموں 2 عدد، سرخ مرچ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، نمک آدھا چائے کا چمچ، پودینہ پیسٹ: 2 کھانے کے چمچ، زیرہ: 1 چائے کا چمچ (توے پر بھون لیں)

ترکیب: میدے میں تیل ملا کر پانی کے ساتھ سخت گوندھ لیں اور پھر اسکی پتلی سے روٹی بیل لیں۔ اس کو کٹر سے گول گول کاٹ لیں۔ خیال رہے کہ آپ ٹکڑے ساتھ ساتھ گیلے ٹھنڈے کپڑے سے ڈھکتے جائیں۔ پھر آئل گرم کر کے فرائی کرلیں۔ اگر کوئی گول گپہ نہ پھولے تو اسے پاپڑی کی طرح استعمال کرلیں۔

املی کو 3-2 گھنٹے کے لیے پانی میں بھگو دیں۔ اس کے بعد گودا نکال کر اس میں باقی چیزیں مکس کرلیں اور ہلکا سا جوش دے لیں۔ پھر ٹھنڈا کر کے 5-4 گلاس پانی ڈال کر کھٹاس بنالیں۔

گول گپے کو پیش کرنے سے پہلے اس کو سائیڈ سے تھوڑا سا توڑ کے اس میں آلو اور چنے بھرلیں اور اسے کھٹاس کے ساتھ پیش کریں۔

چھوہارے کا حلوہ

اجزا: چھوہارے آدھا کلو، شکر ایک پاؤ (زیادہ میٹھا پسند ہو تو شکر کی مقدار بڑھا لیں اپنی پسند کے مطابق)، دودھ ایک کلو، اخروٹ چھوٹے ٹکڑوں میں ایک چھٹانک، بادام دو ٹکڑے کیے ہوئے آدھا پاؤ، کشمش ایک چھٹانک (کچھ دیر کے لیے پانی میں بھگو کر صاف کر لیں)، گھی یا آئل ایک پاؤ۔

ترکیب: چھوہارے کو ایک گھنٹے کے لیے پانی میں بھگو دیں، پھر چھوہارے کی گٹھلیاں نکال کر اچھی طرح صاف کر لیں، دودھ میں چھوہارے ڈال کر بوائل کر لیں، (دودھ میں ایک کلو پانی شامل کریں) جب چھوہارے گل جائیں تو چھوہاروں کو پیس لیں۔ اب آئل گرم کریں، اُس میں پسے ہوئے چھوہارے اور شکر ڈال کر اچھی طرح بھونیں، حلوے کا پانی اچھی طرح خشک ہو جائے اور آئل نظر آنے لگے تو اخروٹ، کشمش، بادام ڈال کر مکس کر لیں۔ حلوہ تیار ہے۔

تربوز کا سوڈا

اجزا: تربوز (چوکور ٹکڑے) دو پیالی، انناس کا جوس آدھی پیالی، کلب سوڈا ایک پیالی، کٹی ہوئی برف ایک پیالی، روز سیرپ ایک کھانے کا چمچ، تربوز کے چھلکوں سمیت ٹکڑے سجانے کے لیے۔

ترکیب: بلینڈر میں تمام اجزاء ڈال کر یکجان کر لیں۔ مزیدار مشروب گلاسوں میں نکال لیں اور تربوز کے ٹکڑوں سے سجا کر پیش کریں۔

میٹھی ٹکیاں

اجزا: میدہ ایک کپ، سوجی ایک کپ، گھی یا مکھن (پھیکا) آدھا کپ، چینی آدھا کپ، چھوٹی الائچی چٹکی بھر (پسی ہوئی)، کھوپرا ایک چوتھائی کپ (پسا ہوا)

ترکیب: سب اشیا ملا کر آٹے کی طرح گوندھ لیں ہتھیلی کی مدد سے خوب اچھی طرح مسلیں سخت پیڑا بنا لیں اور بیل کر موٹی روٹی کی شکل دے لیں اور پھر کٹر کی مدد سے کسی بھی شکل کی چھوٹی ٹکیاں کاٹ لیں۔ ہلکی آنچ پر کم تیل میں ہلکی براؤن تل لیں۔ میٹھی ٹکیاں کا آٹا آپ گوندھ کر فریج میں بھی رکھ سکتی ہیں ایک ہفتہ تک خراب نہیں ہوتا۔

(بحوالہ: www.hamariweb.com)

عظیم اقبال

ایئر فریشر: محفوظ یا غیر محفوظ

اپنے ٹوائلٹ، باتھ روم، کچن، پارلر یا خواب گاہ میں ایئر فریشر کے استعمال کے آپ عادی ہو سکتے ہیں۔ اشتہاری مارکٹنگ کے دباؤ میں آپ کا فیصلہ آپ کے لیے باعث اطمینان ہو سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھیں کہ صحت پر ان کے مضر اثرات جلد یا دیر سے پائے گئے ہیں۔

ان کے استعمال سے بدبو کے بچاؤ، نیز خوشبو کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے ہماری ناخوشگواری عین خوشگواری میں بدل جاتی ہے۔

ویسے یہ واقع ہے کہ گھروں اور دفتروں میں استعمال کیے جانے والے Air Fresher ہماری صحت کی متعدد خرابیوں کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً بچے اور حاملہ خواتین ان کی زد میں ہوتے ہیں۔

ایئر فریشر خواہ اسپرے کی شکل میں ہوں یا ٹھوس شکل میں، دونوں ہی سے خوشبو اور کیمیکل کا اخراج ہوتا ہے جو بدبو کو دباتا ہے۔

واقعتاً ایئر فریشر سے جو کیمیکل خارج ہوتے ہیں وہ نچلی سطح کے زہریلے مادے ہیں۔ ان میں بینزین (Benzene) زائلین (Xylene)، فینول (Phenol) ان سب سے گردے، سانس، جلد اور اعصاب کے لیے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ سانس سے گزر کر یہ ہمارے نازک اعضا کو متاثر اور بیمار کرتے ہیں۔

ایئر فریشر میں ایک بے رنگ گیس فارمل ڈی ہائیڈ (Formal Dehyde) میں موجود ہے۔ اس کے بخارات، اگر تھوڑے سے ہیں، سانس کے ساتھ جسم میں پہنچ جائیں تو وہ کھانسی، گلے کی خراش، آنکھ اور سانس کے مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کیمیکل کا تعلق سرطان (خصوصاً ناک اور خون سے وابستہ ہے) سے بتایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ صحت کے لیے فوری اور دائمی عارضوں کے موجب ہیں۔

ایئر فریشر میں نپھتھیلین (Naphthalene) بھی ہوتا ہے۔ اسے، خون، گردے اور جگر کے لیے برا سمجھا جاتا ہے۔ اس کا برا اثر طویل ہوتا ہے۔ اس میں پائی جانے والی بعض خوشبوؤں کے بارے میں اندیشہ ہے کہ ان سے جسم کے ہارمون درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ اس سے پستان کے سرطان کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لیے یہ خواتین کے لیے نہایت مضر ہے۔

یہ سارے کیمیکلز آہستہ آہستہ جسم میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور اثر انداز ہوتے ہیں۔ سچ مچ یہ ہماری صحت کی خرابی کا باعث بنتے ہیں۔ تحقیق کے مطابق گھروں میں استعمال کیے جانے والے ایئر فریشر کے باعث بچوں میں کان اور معدے کے درد کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔ الہال کا امکان بھی ہے۔ ظاہر ہے ہمارے بچے بھی مثلاً ان کی زد میں ہیں اور وہ آئے دن نئے نئے امراض میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

اندیشہ یہ بھی ہے کہ یہ سارے کیمیکلز دمے کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔ تنفس پر ان کا راست اثر پڑتا ہے۔ دمے میں مبتلا افراد کے لیے دمے کے دوروں کی ابتدا اور اس کے دورانیے میں تواتر کے خدشات بڑھ جاتے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ ان سب سے مدافعتی نظام کمزور ہو جاتا ہے۔ اس سے ہر طرح کے مرض کا حملہ کارگر ہو سکتا ہے۔

درحقیقت ایئر فریشر سے کسی بدبو کو دبانا تو ممکن ہے لیکن اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے مصنوعی خوشبو، بدبو کا سد باب نہیں ہو سکتی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ بدبو کی جو وجہ ہے، اسے ختم کیا جائے۔ سچ مچ دانشمندی کا تقاضہ یہی ہے۔

اصل مسئلے کے حل میں گھر میں پودے رکھنے کی صلاح ہے۔ یہ زہریلے غبارات کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نیز آکسیجن کا اخراج کرتے ہیں۔ اس سے ہوا کی کیفیت بہتر ہو جاتی ہے۔ نہ آپ کا دم گھٹتا ہے اور نہ دیر تک ناک کو ڈھکنے کی نوبت آتی ہے۔ زہر کے پودے خاصے طور پر موثر ہیں۔ ان کا حصول بھی ناممکن نہیں۔ آیئے گھر میں قدرتی خوشبو بنانے کا یہ انوکھا طریقہ اپنائیں۔ لیموں کے کچھ ٹکڑے کاٹ لیں۔ پھر انھیں دیر تک ابال لیں۔ اس کے سبب فضا میں موجود بدبو ختم کرنے میں مدد ملے گی۔ آزما کر دیکھیں۔ آپ حیران رہ جائیں گے۔

ہم یاد دلا دیں کہ مذکورہ خطرات ایئر فریشر (اسپرے) کے علاوہ ہیئر اسپرے، پسینہ روکنے والے اسپرے اور دیگر خوشبویات کے بارے میں بھی ہیں یہ سب ایروسول (Aerosol) کہلاتے ہیں۔

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے استعمال سے اجتناب برتنا لازم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وقتی خوشی پر دائمی صحت کو ترجیح دینا ضروری ہے۔

Azim Iqbal
Adabistan
Ganj No. One
Bettiah-845438 (Bihar)

حسن کی نگہداشت

فیس ویکس کا طریقہ

خواتین اکثر و بیشتر اپر لپس اور چہرے کے اضافی بالوں کی وجہ سے کافی پریشان نظر آتی ہیں۔ انھیں تقریباً ہر ہفتہ ہی پارلر کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ پیسے الگ خرچ ہوتے ہیں اور تکلیف الگ ہوتی ہے۔

ہم آپ کو ایک ایسا گھریلو نسخہ بتانے جارہے ہیں جو آپ کی زندگی آسان کردے گا۔ اس نسخہ میں ہر وہ چیز استعمال ہوگی جو آپ کے گھر میں موجود ہوتی ہے۔

یہ پیسٹ بنانے کے لیے آپ کو تین اجزا درکار ہوں گے۔

اجزا کی مقدار: ایک چمچ چینی، ایک چمچ بیسن، آدھا چمچ ہلدی

بنانے کا طریقہ: سب سے پہلے ایک باؤل میں پانی لیں اور اسے چولہے پر گرم ہونے رکھ دیں۔ دوسری طرف چینی، ہلدی اور بیسن کو ایک کٹوری میں یکجان کرلیں۔

چولہے پر رکھے پانی میں جب بلبلے بننے لگیں تو اس پانی میں اجزاء والی کٹوری رکھ دیں۔ اجزا میں تھوڑا سا گرم پانی شامل کریں اور مسلسل چمچ ہلاتی رہیں تاکہ سب چیزیں اچھے سے حل ہوجائیں۔ چینی چونکہ دیر سے حل ہوتی ہے اس لیے اسے اچھے سے حل کرلیں۔

حسب ضرورت اس میں تھوڑا تھوڑا پانی شامل کرتے رہیں تاکہ پیسٹ بن جائے۔

پیسٹ بن جانے کی صورت میں اسے پانی والے باؤل میں سے دھیان سے نکال لیں اور اسے چہرے پر بالوں والی جگہ پر لگالیں۔

یہ مکسچر اس وقت چہرے پر لگائیں جب اسے باآسانی چھوا جاسکے، گرم گرم پیسٹ آپ کی جلد کو متاثر کرسکتا ہے۔

اس پیسٹ کو چہرے پر اس وقت تک لگا رہنے دیں جب تک کہ یہ خشک نہ ہوجائے۔ اس کے بعد اسے ہاتھ سے مسل کر صاف کردیں۔

ہفتہ میں 2 سے 3 بار اس کا استعمال ضرور کریں۔ اس سے آپ کے چہرے کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچے گا اور بال بھی آسانی سے صاف ہوجائیں گے۔

بال سلکی کرنے کا طریقہ

ایسی خواتین جو چاہتی ہیں کے ان کے بال سلکی اور چمکدار

ہو جائیں اور لگیں وہ ہر دعوت میں بالوں کی وجہ سے حسین تو یہ خاص گھریلو ٹوٹکہ استعمال کریں اور سلکی بالوں سے سب کو حیران کریں۔

اجزا: ایواکاڈو ایک عدد (پیسٹ بنالیں)، انڈا ایک عدد، ایلوویرا جیل دو کھانے کے چمچ، زیتون کا تیل ایک کھانے کا چمچ

طریقہ: اچھی طرح مکس کریں۔ بالوں پر لگا کر بیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ اب بالوں کو دھولیں۔

وٹامن E کیپسول کے فائدے

مرد ہو یا عورت ہر کوئی خوبصورت نظر آنا چاہتا ہے انسان کی خوبصورتی میں جلد اور بال اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اگر آپ کے چہرے پر داغ دھبے ہیں، جلد سوکھی کمزور اور لاغر ہے یا بال گر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی آپ کے ساتھ اگر مسئلہ ہے تو اس کے لیے حاضر ہے وٹامن ای جو آپ کے درج بالا مسائل حل کرنے میں معاون ہے۔

چاول کا پانی لگانے کے فائدے

گوری رنگت کی خواہش تو ہر کوئی کرتا ہے اور ہم بھی آپ کو مختلف حربے بتاتے رہتے ہیں اگر وہ سب آپ نے نہیں استعمال کیے تو آج اس خوبصورت سے نسخے کو استعمال کر کے اپنی خوبصورتی میں چار چاند لگائیں جو بنائے آپ کی رنگت گوری اور کرے آپ کو دودھ کی طرح سفید!

طریقہ: ایک چمچ چاول کو دو چمچ پانی میں دس منٹ بھگو دیں پھر چاول کو ابال لیں۔

ابلے چاول کا پانی ایک پیالی میں الگ کرلیں، اس میں ایک چمچ شہد، ایک چمچ گلاب کا عرق، ایک چمچ لیموں کا رس اور آخر میں ایک چمچ ملیٹھی پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح پیسٹ بنالیں۔

اس پیسٹ کو اپنے چہرے اور جلد پر اچھی طرح لگائیں اور سوکھنے پر سادے پانی سے دھولیں۔

اس کے روزانہ استعمال سے آپ مہنگی فارمولا کریم کو بھول جائیں گے، آپ خود میں واضح فرق محسوس کریں گی۔

□□□

(بحوالہ kfoods.com)

تاثرات: نگر نگر سے

ماہنامہ "خواتین دنیا" بلاشبہ ایک معیاری رسالہ ہے یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد رسالہ ہے اس رسالے میں خواتین سے متعلق تحریرات کو شائع کیا جاتا ہے جو کہ خواتین کی لکھی تخلیقات ہوتی ہیں۔ خواتین دنیا میں۔ جو مختلف مضامین ہر ماہ شائع ہوتے ہیں وہ معلومات کا خزانہ ہوتے ہیں خواتین کے کارناموں سے لے کر گھر گرہستی، صحت اور حسن و نگہداشت جیسے تمام موضوعات کا اس میں احاطہ کیا جاتا ہے جو کہ اس کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اردو ادب کی بقا میں اس ماہنامہ کا بہت بڑا تعاون ہے جو قابل تحسین اور قابل فخر ہے نہ صرف اردو ادب کی بقا بلکہ نسائی ادب کے فروغ میں بنیادی و اہم کام بھی انجام دے رہا ہے۔ یہ رسالہ ہر ماہ قارئین کے دلوں پر ہمیشہ اپنی چھاپ چھوڑ جاتا ہے اور اگلے شمارے کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ دعا گو ہوں کے ماہنامہ خواتین دنیا کی مقبولیت روز بروز خوب سے خوب تر ہو اور یہ رسالہ یوں ہی قارئین کے دلوں پر انمٹ نقوش چھوڑتا رہے۔

روبینہ، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ تعلیم و تربیت، مانو، حیدرآباد

خواتین دنیا کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ ٹائٹل پیج دیدہ زیب ہے۔ مضامین کا انتخاب بھی قابل تعریف ہے۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح پر مغز ہے جس میں سماج کی حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں خواتین کو صنفی امتیاز سے کافی حد تک پاک کیا جا چکا ہے لیکن ابھی بھی سماج میں کچھ طبقے ایسے ہیں جہاں خواتین کو برابری کا درجہ نہیں ملا ہے۔ 'رضیہ سجاد ظہیر کی تخلیقات میں نسائی شعور' ڈاکٹر آمنہ تحسین صاحبہ نے بڑی سلیقہ مندی سے مضمون قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے نسائی ادب پر گفتگو کرتے ہوئے تانیثیت اور نسائی ادب کے فرق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں رضیہ سجاد ظہیر کے مختصر حالات زندگی کو بیان کرتے ہوئے ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے اور ان کے نسائی شعور سے متعارف کرایا ہے۔ 'ناولٹ نگار اردو خواتین' مضمون بھی پسند آیا۔ ''خواتین کو با اختیار بنانے کے اہداف اور حقیقت "میں معصوم زہرا نے کئی اہم پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ افسانے بھی اچھے ہیں۔ شبانہ خاتون کا افسانہ ''زندگی خود ہی گناہوں کی سزا دیتی ہے'' بڑے موثر انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کا اثر تادیر رہتا ہے۔ ''حسرتوں کی قبر پر'' روبینہ ساگر روبی کا بہترین افسانہ ہے۔ جس کی زبان بہت دلکش ہے۔ افسانہ قاری کو شروع سے ہی اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔

ڈاکٹر نشاں زیدی، غازی آباد، یوپی

''خواتین دنیا'' اپریل، 2020 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد اور معیاری رسالہ ہے۔ رسالے کا سرورق نہایت دلکش اور دیدہ زیب ہے۔ سرورق پر خاتون کی تصویر ہندوستانی تہذیب و ثقافت میں رنگی نظر آتی ہے۔ میرے تخلیق کردہ مضمون'' پیغام آفاقی کی افسانہ نگاری: موضوعات و اسالیب'' بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ ''مشعل'' کے عنوان کے تحت صاحب مدیر کے خیالات موجودہ ہندوستانی صورتحال کے لحاظ سے بے حد اہم ہیں۔ قدیم ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی سنہری روایات کا ذکر جہاں ایک طرف اس تہذیب کے استحکام اور پختگی سے واقف کراتا ہے وہیں دوسری طرف اس تہذیب کے مٹنے اور تار تار ہونے پر ہمیں غور و فکر اور تبدیلی کی ضرورت و اہمیت کا احساس بھی دلاتا ہے۔

رسالے میں شامل تمام مضامین اپنی جداگانہ نوعیت اور انفرادی اہمیت کے حامل ہیں۔ روبہ رو کے تحت ''ایک ملاقات ڈاکٹر مینا نقوی سے'' از زیب النساء اس لیے اہم ہے کہ اس کے ذریعہ ہمیں ڈاکٹر مینا نقوی کو کم

وقت میں انھیں بہتر طور پر سمجھنے کا موقع ملا اور رسالے کے باقی مضامین کے مطالعے کا اشتیاق بھی برقرار رہا۔

ڈاکٹر شائقہ آفرین نے شکیلہ اختر کے افسانوں میں موجود عورت کی مختلف جہتوں اور حیثیتوں کو بڑی خوش اسلوبی اور عام فہم انداز میں صفحہ قرطاس پر اتار دیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے مضمون شکیلہ اختر کی بیشتر فکری و فنی خوبیوں کا احاطہ کرتا ہے۔

اقبال کی شاعری میں موجود قومی ہم آہنگی، بھائی چارگی، رواداری اور آپس میں شیر و شکر ہونے کے جذبے کو ڈاکٹر افسانہ حیات نے مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اقبال کے جذبہ حب الوطنی اور احترام آدمیت نے انھیں آفاقی شاعر بنا دیا ہے۔

ماہنامہ کی اشاعت کا ایک خاص مقصد، جہاں تک میرا خیال ہے، خواتین کو ادبی، علمی اور دیگر تمام شعبہ ہائے زندگی میں خود کفیل بنانا بھی ہے، اسی جذبہ کے تحت محترمہ آفرین فاطمہ کا مضمون ''تانیثیت اور اردو ناول'' قابل ذکر ہے۔

حفظان صحت کے حوالے سے ڈاکٹر اشرف غازی کا مضمون ''کورونا وائرس اور خواتین خانہ'' بے حد معلومات افزا ہے۔ اشرف غازی نے اس کی شناخت اور اسباب و علل پر خاصی گفتگو کی ہے۔ میں سمجھتی ہوں ہر ایک کو اس سے واقفیت لازمی ہے۔ اس مہلک مرض کے تعلق سے خواتین کی ذمہ داریاں، اس کے اثرات، بچاؤ کی تدابیر سب کچھ اس مختصر سے مضمون میں سمو دیا گیا ہے۔ مذہب اسلام ان تمام حادثاتی آفتوں سے متعلق احتیاطی تدابیر صدیوں پہلے ہی بتا چکا ہے۔ کاش وہ ہمیشہ سے ہماری معمولات کا حصہ ہوتیں!!!

بہر حال ''خواتین دنیا'' کو پڑھ کر علم میں اضافہ ہوا۔ اس میں متنوع اور رنگارنگ موضوعات کی وسیع دنیا آباد ہے جو رسالے کی مقبولیت، شہرت اور بلندی کی ضامن ہے۔

راحلہ پروین، علی گڑھ

'خواتین دنیا' فروری 2020 نظر نواز ہوا۔ سرورق بہت دیدہ زیب اور پرکشش ہے۔ 'مشعل' کے تحت اردو زبان کا لوک ادب سے کیا رشتہ ہے اور لوک ادب کی اہمیت پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ لوک گیتوں کو عوام کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ لوک ادب عوام کے ذریعے ہی تخلیق ہوتا ہے۔ اس شمارے میں شخصیت کے تحت 'جیلانی بانو کا سماجی و سیاسی شعور' ڈاکٹر بی بی رضا خاتون کے ذریعے لکھا گیا ہے جس میں انھوں نے جیلانی بانو کے افسانوی مجموعہ 'راستہ بند ہے' کے افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ساجدہ زیدی کا مضمون 'انسانی شخصیت' بھی کافی معلوماتی اور دلچسپ ہے جس میں انھوں نے شخصیت کے مذہبی اور فلسفیانہ تصورات اور شخصیت کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔ 'اردو کا داستانوی ادب' عشرت جہاں کے ذریعے تخلیق کیا گیا ہے جس میں انھوں نے داستانوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور مختلف داستانوں مثلاً سب رس، نوطرز مرصع، داستان امیر حمزہ، الف لیلیٰ، آرائش محفل، باغ و بہار، بوستان خیال، فسانۂ عجائب، عجائب القصص، گل بکاؤلی اور گل صنوبر جیسی داستانوں کو اردو فکشن کا عظیم سرمایہ قرار دیا ہے۔ راشد الخیری کے مضمون میں زیب النساء نے راشد الخیری کے نظریۂ تعلیم کو پیش کیا ہے خصوصاً عورتوں کے حوالے سے انھوں ان کی تعلیم کے بارے میں کیا کہا ان باتوں کی طرف تفصیل سے اشارہ کیا گیا ہے۔ راشد الخیری خواتین کی تعلیم کے حق میں تھے اور خواتین کی اصلاح چاہتے تھے۔ 'اکیسویں صدی کے اردو ناولوں کے نسوانی کردار' میں فرح نے خواتین کے ذریعے لکھے گئے ناولوں کا تجزیہ پیش کیا ہے جس میں نسرین فتحی کا 'لفٹ' ترنم ریاض کا 'مورتی' اور 'برف آشنا پرندے' ثروت خان کا 'اندھیرا پگ'، خالدہ حسین کا 'کاغذی گھاٹ' نسرین ترنم کا 'فصلیں' اور 'موسم' اشرف جہاں کا 'نرملا' افسانہ خاتون کا 'دھند میں کوئی روشنی' نسرین بانو کا 'ایک اور کوسی'، آشا پربھات کا 'دھند میں اگا پیڑ' ناصرہ شرما کا 'بہشت زہرا'، شفیقہ بیگم کا 'خلش' شائستہ فاخری کا 'نادیدہ بہاروں کے نشاں'، 'صدائے عندلیب' اور 'اداس لمحوں کی خود کلامی' قمر جمالی کا 'آتش دان' نیلوفر کا 'اوڑم لین' اور صادقہ نواب سحر کا 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' اور 'جس دن سے' وغیرہ ناولوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ 'دیوداس ایک مطالعہ' رائحہ انصار کے ذریعے لکھا گیا ہے جس میں شرت چندر کے معروف ناول 'دیوداس کا' کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اس ناول میں جاگیردارانہ نظام، ذات پات اور بے میل شادی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ 'قیدی کا کمبل اور احمد فراز' میں مصنفہ نے احمد فراز کی شعری تخلیقات کو پیش کیا ہے اور ان کی شاعرانہ فکر پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ شاہدہ شاہین کا افسانہ 'ریچھ' بھی پسند آیا۔ شگفتہ باجی کی کہانی پڑھ کر دل غمگین ہو گیا۔ ڈاکٹر رمیشہ قمر کی کہانی 'متاع زیست' بھی پسند آئی۔ طلعت سروہہ کی دونوں غزلیں بہتر ہیں۔

'لذیذ پکوان' کی تمام ڈشیز گھر پر بنانے کی کوشش کی۔ صحت کے تحت جو مضمون دیا گیا ہے وہ بھی لائق توجہ اور کافی معلوماتی ہے۔ حسن کی نگہداشت کے ٹوٹکے مفید اور کارآمد ہیں۔ تاثرات کے تحت قارئین کے خطوط شامل ہیں۔ 'خواتین خبرنامہ' پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ خدا سے دعا گو ہوں کہ یہ رسالہ اسی طرح ترقی کرتا رہے۔

مہوش تنزیل، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ثانیہ نے رقم کی تاریخ، جیتا فیڈ کپ ہرٹ ایوارڈ

ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی، 11 (مئی یو این آئی) ہندوستان کی ٹینس اسٹار ثانیہ مرزا نے فیڈ کپ ہرٹ ایوارڈ جیت کر نئی تاریخ رقم کی ہے۔ وہ یہ ایوارڈ جیتنے والی ہندوستان کی پہلی کھلاڑی ہیں۔ ثانیہ نے اس تاریخی کامیابی پر فخر اور خوشی ظاہر کی ہے اور 2000 ڈالر کی انعامی رقم

تلنگانہ وزیر اعلیٰ راحت فنڈ میں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہندوستانی ٹینس کی تاریخ میں یہ ایوارڈ پہلی بار آیا ہے۔ ثانیہ کو فیڈ کپ ایشیا/اوشیانا گروپ ون ہرٹ ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا اور اس ایوارڈ کے لیے نامزد ہونے والی وہ پہلی ہندوستانی خاتون کھلاڑی بنی تھیں۔ سابق ڈبلز نمبر ایک اور کئی بار کی گرینڈ سلیم فاتح ثانیہ 2016 کے بعد پہلی بار اس فیڈ کپ ٹیم میں شامل ہوئی تھیں۔ انھوں نے انکتا رینا کے ساتھ مل کر بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندوستان کو پہلی بار فیڈ کپ کے پلے آف میں پہنچایا تھا۔ اس سال فیڈ کپ کی بہترین کارکردگی کو دیکھتے ہوئے فیڈ کپ ہرٹ ایوارڈ گروپ ون کے لیے چھ کھلاڑیوں کو نامزد کیا گیا تھا۔ ہرٹ ایوارڈ کی فاتح کا اعلان آن لائن ووٹنگ کی بنیاد پر کیا گیا۔ شائقین نے ایک سے آٹھ مئی کے درمیان آن لائن ووٹنگ کراس کے فاتح کا فیصلہ کیا۔ اس سال تین علاقائی گروپ ایک کے لیے کیے گئے 16985 ووٹوں میں سے ثانیہ کو 10 ہزار سے زائد ووٹ ملے۔ ثانیہ کا ووٹ فیصد 60 فیصد سے زیادہ رہا جس سے فیڈ کپ مقابلہ میں ان کی عالمی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ حیدر آباد کی 33 سالہ ثانیہ نے کہا کہ سال 2003 میں ہندوستان کی پہلی بار نمائندگی کرنا میرے لیے سب سے بڑے اعزاز کی بات تھی اور اس ایوارڈ کو جیتنے والی پہلی ہندوستانی بن کر میں فخر محسوس کر رہی ہوں۔ میرا 18 سال کا طویل کیرئیر ہے اور میں ہندوستانی ٹینس ٹیم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کر کے فخر محسوس کرتی ہوں۔ فیڈ کپ ایشیا/ اوشیانا ٹورنامنٹ کے نتیجے میرے کیرئیر کی بڑی کامیابیوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایسا لمحہ ہے جس کے لیے ہر کھلاڑی کھیلتا ہے اور میں فیڈ کپ ہرٹ ایوارڈ جیتنے پر بہت خوش ہوں۔ ثانیہ نے کہا کہ میں مستقبل میں ملک کو اور فخر دلانے کی کوشش کروں گی۔ میں اس ایوارڈ میں ملی رقم کو تلنگانہ وزیر اعلیٰ راحت فنڈ میں عطیہ کرتی ہوں تاکہ کورونا وائرس کے بحران سے گزر رہے مشکل وقت میں کچھ مدد کی جا سکے۔ اس ایوارڈ میں ہر کلاس میں فاتح کو 2000 ڈالر دیے گئے۔ اس ایوارڈ کے لیے ایشیا/اوشیانا علاقے سے ثانیہ کا مقابلہ انڈونیشیا کی 16 سالہ پرسکا میڈ لین نگروھو سے تھا جس میں ثانیہ فاتح بنیں۔ یورپ/افریقہ علاقے سے ایسٹونیا کی اینیٹ کونٹا ویٹ اور لکسمبرگ کو ملا۔ امریکہ علاقے سے میکسیکو کی فرنانڈو کونٹیراس گومز اور پیراگوئے ویرونیکا کیپیڈے روگ کے درمیان مقابلہ تھا اور گومز فاتح بنیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

عام لسانیات

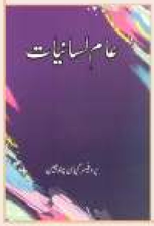

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب

مرتب: محمد حسن

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 600

قیمت: 265 روپے

قومی تہذیب کا مسئلہ

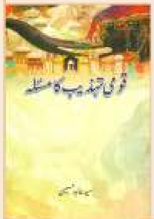

مصنف: سید عابد حسین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 220

قیمت: 120 روپے

اردو املا

مصنف: رشید حسن خاں

پانچویں طباعت: 2019

صفحات: 706

قیمت: 240 روپے

کلیاتِ سراج

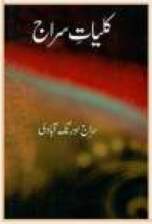

مصنف: سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 732

قیمت: 320 روپے

تاریخ تحریکِ آزادیِ ہند

مصنف: تاراچند

صفحات: 736

قیمت: 310 روپے

مجمع البحرین

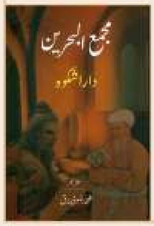

مصنف: داراشکوہ

مترجم: طلحہ رضوی برق

صفحات: 36

قیمت: 45 روپے

علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات

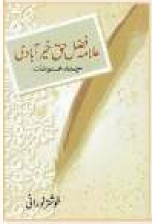

مصنف: خوشتر نورانی

صفحات: 248

قیمت: 110 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly June 2020, Vol. 4, Issue: 6
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025